کتب نما

پروفیسر حسین سحر

نظموں کی کہکشاں

اقبال ارشد کی شعری کائنات میں جہاں غزلوں کے سینکڑوں سیارے گردش کر رہے ہیں وہاں اس کی رنگا رنگ نظموں کی ایک کہکشاں بھی آباد ہے جو جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو اس کی غزل پر بھی اس کی نظم کا زیادہ اثر ہے اور یہ اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے۔

اب تک اس کی غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے نظر انداز ......لیکن اس کی نظموں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔فصیل و پرچم،خماسی اور سرمایۂ حیات،جن میں "خماسی" نظم کی دنیا میں اس کا ایک خوبصورت تجربہ ہے اور فصیل و پرچم اور سرمایۂ حیات اس کی دینی اور ملی نظموں پر مشتمل ہیں۔اس کا تازہ مجموعۂ نظم "کہکشاں کے درمیاں" ہے جس میں واقعی ن ظموں کی ایک کہکشاں ہے جو بحرِ ذخار کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔اس میں اس کی ۱۱۷ نظمیں شامل ہیں اور ساری کی ساری اس کے اُسلوبِ خاص کی نمائندہ ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اقبال ارشد کا یہ اسلوبِ خاص کیا ہے؟ اس کے لیے ہمیں شاعر کے فکری سفر اور شعری ارتقاء پر غور کرنا ہوگا اور اس کے اسلوبِ شعر کے عناصرِ ترکیبی کو دیکھنا ہوگا۔

اقبال ارشد کے ہمدمِ دیرینہ اور اس کے یارِ غار کی حیثیت سے مَیں جانتا ہوں کہ لڑکپن ہی سے اُسے غالب،اقبال،جوش،فیض اور اختر الایمان پسند رہے ہیں۔غالب سے اُس نے فکری گہرائی،تو اقبال سے سخن کی رعنائی کا اکتساب کیا ہے۔جبکہ جوشؔ سے شوکتِ لفظی اور فیض سے جمالِ اظہار کا اثر لیا ہے۔اختر الایمان کی معریٰ نظموں کے ڈکشن اور طرزِ بیاں سے بھی وہ متاثر ہے۔ان سارے باکمال شاعروں کے فکر و فن کو اس نے اپنی ذات میں سمو کر ایک روشن خیالی اور نادر اسلوبی سے مرکب تخلیقی شاعری کو پیش کیا ہے جو اپنے اندر ایک سدا بہار کشش اور جاذبیت رکھتی ہے۔

اس کی نظموں کے عنوان اس کے ہاں جہاں زندگی کی رنگا رنگی کی علامت ہیں وہاں ایک خوابناک تجرید کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً کالے سمندر میں سفر کی ایک رات،کمپلیکس،ساعتوں کے زخم،آواز کی روح،روح کی آواز،تعبیر ایک خواب کی،فانوسِ دل،سرحدِ حرماں،مرگِ مناظر،خواب کا شعلہ،آخری رات کا سفر،پیاسی روح کا سفر،نیا افق پرانا آدمی،خواب جزیرہ،آوارہ آوازیں،خوشبو کا خوف،تصوریہ،روح کا غم،طلسمِ ہوشربا،سرِ ساحلِ بصارت،خلا ناممکن ہے اور سفر جاری ہے۔ یہ تجرید اور تشکیک کی فضا ان نظموں کے متن پر طاری ہے جو مجموعی طور پر ان کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔

مقفّٰی اور غیر مقفّٰی معریٰ اسلوب کے علاوہ اُس نے کچھ آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن زیادہ تر اس کی نظمیں پابند صورت میں ہی ہیں۔

جہاں تک ان نظموں کے موضوعات کا تعلق ہے فراق،نارسائی،پیاس اور خواب اُس کے سب سے اہم موضوع ہیں۔

فراقِ محبوب سے جدائی کی صورت میں ہو یا روحِ ازل سے دوری اور اس کی مجبوری کی شکل میں اس کے ہاں چھایا ہوا ہے۔نارسائی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ہر جگہ منزل سے محرومی اور اس کے نتیجے میں ناصبوری اس کا مقدر نظر آتی ہے۔اس نارسائی کے نتیجے میں ایک تشنگی اور ادھورے پن کا عالم دکھائی دیتا ہے اور اس ساری کیفیات پر سوتے جاگتے ایک کہر آلود خواب کا سا سماں محسوس ہوتا ہے۔

اس طرح ان نظموں پر حزن اور الم کی ایک نیم تاریک فضا سایہ فگن نظر آتی ہے۔اس کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت اس کے مصرعوں کا بے ساختہ پن ہے جن میں شگفتگی،روانی اور ترنم ہے۔بعض اوقات اس کی نظم پڑھتے ہوئے ہمیں غزل کا سا رچاؤ محسوس ہوتا ہے اور اس کی ایک نظم کا عنوان بھی نظم میں غزل ہے۔

صنفِ شعری حیثیت سے نظم اور غزل کا اپنا اپنا مزاج ہے۔نظم میں تسلسل اور وحدتِ تاثر لازمی ہے جبکہ غزل میں اس کے برعکس ریزہ خیالی اور تاثر کی رنگا رنگی ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر نظم گو عام طور پر غزل کے میدان کا شہسوار اور ہر غزل گو نظم کی دنیا کا فاتح نہیں ہوتا۔لیکن بعض اوقات اس

آغازِ کلام

اقبال ارشد میرا بہترین دوست ہی نہیں میرا ہمزاد بھی ہے۔اس کی اور میری شاعری کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔اب سے کوئی چالیس برس پہلے مشقِ سخن کے اس طویل تجربے کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو شاعر کہلانے کے لئے تیار نہیں۔ورنہ آج تو یہ کیفیت ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔دو چار غزلیں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کیں اور مجموعہ منظرِ عام پر آیا اور پھر اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی ایسے ابلاغِ عامہ کے ذرائع کی سہولیات، ایک شاعر راتوں رات شہرت کی بلندیاں چُھونے لگتا ہے۔مگر ہوتا کیا ہے جونہی میڈیا کی بیساکھیاں چھنتی ہیں۔شاعر گمنامی کے گہرے غاروں میں جا گرتا ہے اور دو چار سال بعد کوئی اس کا نام تک نہیں جانتا۔اور میرے خیال میں ایک سچے شاعر اور عام متشاعر میں یہی فرق ہے۔آج جو نوجوان شعراء بیس بیس مجموعے چھپوائے پھرتے ہیں وہ ان متشاعروں ہی کی صف میں آتے ہیں۔اقبال کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔وہ ایک پیدائشی اور فطری شاعر ہے۔شعر جس کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔اُسے کسی بیساکھی کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔تعلقاتِ عامہ کا آدمی ہوتے ہوئے بھی وہ میڈیا سے بے نیاز ہے۔اور سچ تو یہ ہے کہ کسی قسم کی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر ہی اس کا فن مسلسل ارتقاء کی طرف گامزن ہے اور یہی اس ہجوم میں اس کی الگ پہچان ہے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ وہ میرا ہمزاد ہے۔اس کی تعریف میں نہیں کر سکتا۔بھلا کوئی اپنی بھی تعریف کر سکتا ہے؟ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ اس کی شاعری میرے لئے باعثِ فخر ضرور ہے۔میں خود تو جیسا کیسا شاعر ہوں لیکن اقبال ارشد کے بارے میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہے۔ایک صاحبِ طرز ادیب ہے۔بات یہاں اس کی شاعری کی ہو رہی ہے۔وہ غزل اور نظم دونوں اصناف پر حاوی ہے۔اس کی غزل میں جدید حیت کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کا مکمل کرب پنہاں ہے۔اس طرح اس کی نظم میں اس کی غزل کا

میں ایک استثناء کی بھی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اقبال ارشد کے خلاق قلم کو یہ استثناء حاصل ہے کہ وہ نظم میں غزل اور غزل میں نظم لکھنے پر قادر ہے۔

مَیں نے پہلے کہا ہے کہ اقبال ارشد بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے لیکن ارضِ غزل بھی اس کی مفتوحہ مملکت میں شامل ہے۔کہکشاں کے درمیاں کی یہ نظمیں قاری کو جہاں ایک خوبصورت اسلوبِ شعری سے آشنا کریں گی وہاں اس کے لیے ایک خوشگوار تحیر کے ساتھ ساتھ تسکینِ روح کا سامان بھی مہیا کریں گے۔

اُردو کے شعری سرمائے میں ان دلکش، دلآویز اور دلفریب نظموں کا میں والہانہ استقبال کرتا ہوں کہ یہ شاعری واقعی ایک گراں بہاں اور گراں قدر اثاثہ ہے۔مجھے امید ہے کہ ہمارے آسمانِ شعری پر روشن نظموں کی یہ کہکشاں ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

بانکپن اور رعنائی پوری طرح شامل ہے۔

بنیادی طور پر اقبال ایک مذہبی آدمی ہے۔ پکا مسلمان اور سچا پاکستانی، یہی وجہ ہے کہ اس کی ایمانی شاعری ہی اس کا اصل جوہر ہے۔ عقیدے اور ایمان کی پختگی اس کے ماحول کی دین ہے۔ اقبال کا تعلق انبالے کے ہاشمی محلے کے ایک ایسے راسخ العقید مسلمان گھرانے سے ہے کہ روحانیت جس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس کے والد ٹھیکیدار محمد حیات ہاشمی ایک صاحبِ دل اور صاحبِ نظر صوفی تھے۔ انہوں نے اقبال کی تربیت اس ڈھب سے کی کہ عشقِ رسولؐ اور مودتِ اہلبیتؑ اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئے۔ ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔

مسلمانوں کے لئے برصغیر میں ایک نئے وطن کے حصول کی جدوجہد اقبال نے اپنے بچپن میں آزادی کے لئے مر مٹنے کا جوجذبہ دیکھا اس کے نقوش اس کے قلب و ذہن کا حصہ بن گئے اور جب اس نے ہوش سنبھالا تو ایک آزاد مملکت میں خود کو سانس لیتا ہوا پایا۔ یوں گویا آزادی کی جو قدر و قیمت وہ جانتا ہے اس کی عمر کے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ اس لئے میں نے اُسے پکا مسلمان اور سچا پاکستانی کہا ہے۔ ویسے بھی ایک پکے مسلمان اور سچے پاکستانی میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اصل میں ایک ہی ہیں۔

اقبال کی دینی اور ملی شاعری کا ایک مجموعہ آج سے کچھ عرصہ بیشتر "فصیل و پرچم" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ موجودہ کتاب اس موضوع پر ان کی دوسری کتاب ہے جس میں دینی، ملی اور ذاتی موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔

آیئے ذرا ان منظومات کے حوالے سے کچھ بات ہو جائے۔

اس کی دینی شاعری حمد، نعت، منقبت، سلام اور قصائد پر مشتمل ہے۔ لیکن ان معنوں میں روائتی نہیں کہ صرف خانہ پری کے لئے قافیہ پیمائی کی جائے بلکہ اس کی ہر مذہبی نظم شعریت اور ادبیت کے اس مقام پر ہے جہاں انفرادیت کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ ہیئت میں گو اس نے زیادہ تجربے نہیں کئے اور بیشتر نظمیں روائتی ہیئت ہی میں ہیں لیکن ان کا نفسِ مضمون اس لحاظ سے بالکل جدید ہے کہ یہ اس کے اپنے خیالات ہیں۔ کہیں سے کوئی چربہ نہیں اتارا گیا۔ اور نہ کسی دوسرے کے خیال کا عکس ہیں۔ بیشتر اس کی اپنی دلی واردات ہیں۔ اپنے روحانی تجربات ہیں۔ عقیدے کی یہ شاعری دراصل اس کے بزرگوں کا ہی فیضانِ نظر ہے۔ مکتب کی کرامت نہیں۔ کیونکہ اس شاعری میں سرمستی اور سرشاری کی جو کیفیت ہے۔ وہ روحانیت ہی کا اعجاز ہو سکتی ہے۔ فلسفے کا کرشمہ نہیں اس کی دینی شاعری میں قصائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں اس کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ قصیدہ میمیہ۔ جو محسن کاکوروی کے قصیدہ لامیہ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور بجا طور پر ایک اضافہ ہے۔ اس طرح قصیدۂ نونیہ ہے۔ قصیدۂ حسن جو میرے نزدیک ایک شاہکار سے کم نہیں اور یوں دورِ حاضر جو فنی لحاظ سے قصیدے کے شان و شکوہ سے عاری ہے۔ ان قصائد کے سبب ان خزائنِ شعری سے مالا مال نظر آتا ہے۔

عروسیہ ایک بالکل نئی صنفِ سخن ہے۔ جس کے محرک ہمارے دوست سید محمد احمد زیدی ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے اپنی بچی کی شادی کے موقع پر اسلامی اور ایمانی گیت لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ مشاہیر اسلام کی تقریباتِ عروسی کی یاد میں چند ایسی محافل منعقد کی گئیں جہاں ان مقدس ہستیوں کے سہرے یا ان کی شادی پر تہنیتی نظمیں پڑھی گئیں۔ بعد میں ایسی نظموں کو عروسیہ کا نام دے دیا گیا۔ اس کتاب میں اقبال ارشد نے بھی دو عروسیہ نظمیں شامل کی ہیں۔ ایک عروسیہ حضرت امام حسنؑ اور دوسرا حضرت امام حسینؑ سے متعلق ہے۔ دونوں بڑی مرصع نظمیں ہیں اور جب مذکورہ بالا محافل میں پڑھی گئیں تو حاصلِ نشست قرار دی گئیں۔ خاص طور پر حضرت امام حسنؑ کا عروسیہ اس کا ڈکشن قدرے ہندی آمیز ہے اور یہاں شاعر پر میر جعفر طاہر کے اسلوب کا اثر نمایاں ہے۔ وہی لفظوں کی گھن گرج، مصرعوں کی تلاطم خیز روانی اور شعروں کا ترنم ریز تسلسل منظر نگاری ایسی چابکدستی سے کی گئی ہے کہ زبان و مکان کی سب حدیں ختم ہوتی نظر آتی ہیں۔ بہر حال یہ قصیدہ جدید اُردو قصائد کی تاریخ میں ایک خوب صورت اضافے کے طور پر یادگار رہے گا۔

آفتابِ سحر رہبر عالمِ اسلامی حضرت امام خمینیؒ کی انقلاب آفریں شخصیت کی بارگاہ میں ایک شعری خراجِ عقیدت ہے۔جسے خلوصِ دل سے تحریر کیا گیا ہے۔

اقبال کی ملی نظموں میں رجز۔ضمیر کی آواز اور غداران وطن سے اس لحاظ سے اہم نظمیں ہیں کہ ان کی مدد سے شاعر وطن پرستی کے تعمیری جذبے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔فلسفۂ حیات، زبان، ایک اور بات، بازگشت، سماعت، تحریر بر فضا، سوچ ماضی حال اور مستقبل اور سال کی آخری نظم اقبال کے خاص آہنگ کی نظمیں ہیں۔بہاریہ۔دعائیہ۔جو اس نے اپنی بچی کی رخصتی کے موقع پر کہیں۔اور ان نظموں میں شاعر سے زیادہ وہ ایک مشفق باپ کی حیثیت سے اپنے جذباتِ دلی کا اظہار کرتا ہے۔پھر تین مرثیے ہیں ایک اپنے عزیز دوست جبران کے لئے اور دو اپنے جواں سال بیٹے علی عدنان کی یاد میں۔علی عدنان جسے وہ پیار سے صرف شان کہا کرتا تھا۔اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔جوانِ رعنا بائیس سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔جب اس کی موت کی خبر میں نے اپنے والدِ مرحوم کو سنائی تو انہوں نے ایک طویل سرد آہ کھینچی اور برا پشاوری کا یہ مصرع دہرایا۔

برواسیاں درختاں دی کرے راکھی

میوہ پکے تے کھان نصیب والے

اور پھر وہ اس مصرعے کی بار بار تکرار کرتے رہے۔تقریباً ایک ہفتے بعد وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔لیکن اس مصرعے کی معنویت میرے دل و دماغ میں پیوست کر گئے۔میرے والد مرحوم بھی پنجابی کے ایک خوش گو شاعر تھے اور اقبال ارشد کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز جانتے تھے۔پھر بھلا بیٹے کے صدمے کو کیونکر برداشت کرتے۔چنانچہ چند دن بعد وہ بھی راہئ ملکِ عدم ہوئے۔

شان کے لئے اقبال نے جو نظم کہی ہے۔وہ ایک ایسا مرثیہ ہے جو ہماری جدید شاعری کی تاریخ میں کم ہی نظر آتا ہے۔اس نظم میں ہجر کے جاں گسل لمحات اور مجبوری کی خوں چکاں کیفیات کو معجزاتی اُسلوب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شاعر کا دکھ اس کا غم ذاتی سطح سے بلند ہو کر آفاقی دکھائی دیتا ہے۔اور یہی کسی فن پارے کی کامیابی کی دلیل ہے۔بہر حال یہ تمام نظمیں اقبال ارشد کے فکر و فن کا ایک ایسا روشن آئینہ ہیں۔جس میں ہمیں اس کے شعری سفر کے اہم سنگِ میل میں صاف نظر آتے ہیں۔

مرشدِ من

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ ان صوفیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں جن کے ارادت مند لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور جنوبی پنجاب کا خطہ خاص طور پر ان کے روحانی فیوض و برکات کا مرکز ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایک ولی کامل تھے بلکہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت عالمگیر ہے۔ ان کی سوز و گداز سے پر کافیاں آج بھی محبت بھرے دلوں کو گرماتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرائیکی یعنی ملتانی زبان کے وہ سب سے بڑے شاعر ہیں۔

گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں خواجہ صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری پر متعدد اہل قلم نے طبع آزمائی کی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ حال ہی میں خواجہ صاحب کے ایک ارادت مند جناب محمد سعید احمد شیخ نے اپنے مرشد کی حیات مبارکہ پر چند تحقیقی مضامین کو ''مرشدِ من'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس سے پیشتر جہانِ فریدؒ کے عنوان سے مؤلف نے خواجہ صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر غالباً پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تصنیف تحقیقی نقطۂ نظر سے کس قدر دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل ہو گی۔ مثلاً شخصیت فرید اپنے عہد کے تناظر میں۔ عشق مصطفیٰؐ اور خواجہ فرید خواجہ فرید اور کافی، دیوانِ فرید کے اوزان اور قوافی کا مسئلہ۔ خواجہ فرید اور ملتان۔ خواجہ فرید کے ایک سید مرید کا احوال۔ خواجہ صاحب اور میری مریدی۔ خواجہ صاحب کا ساون سے عشق۔ خواجہ صاحب کا اپنے ملازمین کے ساتھ حسن سلوک۔ خواجہ صاحب اور نازک مزاجی۔ خواجہ صاحب اور ملائیت۔ خواجہ صاحب کے روہی میں گزرے ایام کا احوال۔ شخصیت فرید کا سماجی پہلو اور خواجہ صاحب کا سفرِ حج۔ اس کتاب میں مؤلف نے خواجہ صاحب کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ نہایت سادہ معصوم اور ہر طرح کے تصنع اور ریاکاری سے پاک سچے اور کھرے دل کے انسان کی تصویر ہے۔ ان کی سوچ بے لوث اور ان کا اٹھنا بیٹھنا اور دیگر معمولات اس قدر سادہ اور عام سے ہیں کہ وہ کہیں سے بھی ایک سکہ بند مفکر یا نہایت قابل استعداد فلسفہ دان یا کسی بڑی گدی کے سجادہ نشین یا کئی نوابوں اور رئیسوں کے پیر دکھائی نہیں دیتے۔

کتاب کی زبان اور اس کا انداز بیان سادہ مگر دلچسپ اور پر اثر ہے۔ بقول ظہور دھریجا اس کتاب کی بدولت فریدیات کے طالب علموں کے سامنے یہ عقدہ کھلنے چلا ہے کہ ایک عظیم آدمی کس کمال طریقے سے دنیاوی ایام حیات بسر کر کے حیات جاوداں کی طرف روانہ ہوا۔ یوں یہ کتاب فریدیات میں ایک وقیع اور گراں بہا اضافہ ثابت ہو گی۔

تیری یادوں کے نقوش

فیض احمد فیض، علامہ اقبال کے بعد دورِ حاضر کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی صدی انہی کی صدی ہے۔ اردو شاعری میں ان کا اسلوب اپنے معاصرین میں سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ فیض 1911ء میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے آجکل ان کا صد سالہ جشن ولادت منایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ "تیری یادوں کے نقوش" جس میں فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور خاکوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کے مرتب معروف نوجوان اہل قلم شاکر حسین شاکر ہیں۔ جنھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے اسے مرتب کیا ہے۔ لکھنے والوں کی فہرست الف بائی ترتیب سے ہے اور اس میں جن معروف و غیر معروف ادیبوں کی ۱۰۴ تحریریں شامل ہیں۔ ان میں آغا ناصر، ڈاکٹر آفتاب احمد، آئی اے رحمان، ابراہیم جلیس، احمد سلیم، اختر جمال، اشفاق احمد، افتخار عارف، امرتا پریتم، انتظار حسین، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ایوب مرزا، اے حمید، پیر حسام الدین راشدی، جگن ناتھ آزاد، حمید اختر، خلیق انجم، خواجہ احمد عباس، رام لعل، ساقی فاروقی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر سلیم اختر، شاہد احمد دہلوی، صوفی تبسم، ظ انصاری، عشرت رحمانی، علی سردار جعفری، فارغ بخاری، فخر زمان، فقیر وحید الدین، فکر تونسوی، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، کشور ناہید، کنہیا لال کپور، مرزا ظفر الحسن، مستنصر حسین تارڑ، مشتاق یوسفی اور یاسر عرفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کی بیگم ایلس فیض۔ ان کی صاحبزادیوں سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی اور خود فیض صاحب کی اپنی تحریر بھی شامل ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فیض کے معاصرین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر صلاح الدین حیدر کے نام ہے اور اسے بڑی تقطیع کے سات سو سے زائد صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فیض کی دل نشیں شخصیت اور ان کی دل نواز شاعری کو سمجھنے کے لئے کتاب میں شامل اکثر مضامین نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ جو فیض شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ معاون ثابت ہوں گے۔ ملک کے معروف ناشر ادارے سنگ میل پبلی کیشنز نے اس ضخیم دستاویز کو شائع کر کے فیض ایسے عظیم اور مقبول شاعر کے حضور ان کے شایانِ شان خراج تحسین پیش کیا ہے۔

وارے نیارے

ہمارے یہاں طنز ومزاح کی حقیقت مسلمہ ہے۔ ہر دور میں شگفتہ اور لطیف تحریریں اردو کے دامن کو سدا بہار پھولوں کی طرح مہکاتی رہی ہیں۔ لمحہ حاضر میں بھی اس کی خوشبو سے ادب معطر ہے۔ بزرگ اہل قلم مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کے دوش بدوش نوجوان لکھنے والے بھی اس میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ انہی نوجوانوں میں مہزاد سحر کا نام بھی آتا ہے۔ مہزاد کی کتاب "وارے نیارے" طنز ومزاح پر مشتمل ان کے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن 1993ء میں منظر عام پر آیا تھا جبکہ دوسرا ایڈیشن 1997ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے مضامین کے عنوانات سے اس کے موضوعات کی رنگارنگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہیلو ہیلو۔ موٹاپا۔ مس پپی بائی۔ آئی لو یو۔ اشتہارات۔ رونمائی۔ کاش ہم لڑکی ہوتے۔ گلو۔ ہیئر کٹنگ۔ تعلیم بال غاں غوں۔ فرسٹ ایڈ۔ انجن نیرنگ اور وارے نیارے کنوارے۔ مصنف چونکہ خود نوجوان ہے اور یہ مضامین اس نے یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران لکھے ہیں۔ اس لئے فطری طور پر یونیورسٹی کے خاص ماحول کی ترجمانی اس میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں عام سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ وہاں بھی ایک نوجوان کے نقطہ نظر کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ یوں پوری کتاب کے مزاج پر ایک تروتازگی کی لہر چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ مشکل سے مشکل اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کے بیان میں بھی ہمیں شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کا انداز بیان سادہ مگر نہایت دلچسپ ہے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے برمحل جملوں کی بدولت مضحک صورتحال دکھائی دیتی ہے تو کہیں بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بات سے بات پیدا کی گئی ہے اور مہزاد کا یہی اسلوب اسے دوسرے نوجوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی تحریروں سے چند اقتباسات دیکھئے۔

اخبار دیکھ کر لگتا ہے کہ کرکٹ کے پچاس ہزار تماشائیوں میں صرف لڑکیاں ہی ہیٹ پہنے بھرپور داد دے رہی تھیں۔ (کاش ہم لڑکی ہوتے)

آغا کا کہنا ہے کہ وہ پیدائشی شاعر ہیں اور پیدا ہوتے ہی انہوں نے یہ شعر عطا کیا تھا۔

آں آں اوں اوں ۔۔۔۔۔ دفع دور ۔ فٹے منہ

خیال رہے کہ دوسرا مصرع سامنے کھڑی نرس نے ادا کیا تھا۔ (رونمائی)

بیوی کے سامنے آئی لو یو کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا وصیت کے آخری الفاظ دہرانا (آئی لو یو)

گلو کی آواز اتنی بھاری تھی کہ اگر وزن کراتے ہوئے بول پڑتا تو مشین دگنا وزن بتاتی تھی۔ (گلو)

لڑکی چاہے بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ جیل کی دال کی طرح پتلی ہے تو بہر حال لڑکی ہے۔ لیکن اگر وہ بہت موٹی ہے تو لڑکی نہیں صرف موٹی ہے۔ (موٹاپا)

نثری نظم کاغذ پر دیکھنے سے شاعری اور زبانی سننے پر جملہ لگتی ہے۔ (مس پپی بائی)

بچپن میں آواز ایسی تھی کہ ابا کے دوست فون پر بات بیٹی کہہ کر شروع کرتے اور اب تو اتنی بھاری ہوگئی ہے کہ ریٹائرڈ حضرات بھی فون پر انکل سے بات شروع کرتے ہیں۔ (ہیلو ہیلو)

ہم نے یونیورسٹی میں ایسی ایسی لڑکیوں کو بھی گردن اکڑا کر چلتے دیکھا ہے۔ جن کی گردن تو صراحی دار نہیں ہوتی۔ البتہ سراپا ضرور مٹکا نما ہوتا ہے۔ (انجن نیرنگ)

کچھ لوگ مونچھیں اس طرح مروڑتے بلکہ نچوڑتے ہیں کہ بالکل دھوبی لگتے ہیں۔ (ہیئر کٹنگ)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہزاد کا مشاہدہ کس قدر گہرا ہے۔ کتاب میں ہر مضمون کے ساتھ موضوع سے متعلق ایک دلچسپ تصویری خاکہ بھی شامل ہے۔ جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

اس سے پہلے بچوں کے لئے "بدحواسیاں" کے عنوان سے مصنف کی ایک اور کتاب بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ لیکن "وارے نیارے" کی اشاعت سے ان کا شمار باقاعدہ مزاح نگاروں کی صف میں ہوگیا ہے۔ بہرحال "وارے نیارے" ہمارے شگفتہ ادب میں ایک خوبصورت اور سدا بہار شگفتہ اضافہ ہے۔ امید ہے کہ مہزاد اس سلسلے کو جاری رکھیں گے اور یہ کتاب ان کی آئندہ کتاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

خانوادہ اجتہاد کے مرثیہ گو

سید قائم مہدی نقوی اجتہادی ساحرؔ لکھنوی ممتاز شاعر ادیب، مورخ اور محقق ہیں۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ آثار وافکار اکادمی پاکستان کے وہ روح رواں ہیں۔ ان کی تازہ تالیف خوانوادہ "اجتہاد کے مرثیہ گو" منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی گیارہ کتابیں۔ شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) مرثیہ۔ قطب شاہ سے ساحرؔ تک (۲) آیات درد (مجموعہ مراثی) (۳) احساس غم (مجموعہ مراثی) (۴) "علم اور علماء" (شخصی مرثیہ) (۵) "علم اور علما" (مطبوعہ دہلی) (۶) فقہ و شمشیر (مرثیہ مطبوعہ دہلی) (۷) صحیفہ مدحت (مجموعہ قصائد) (۸) یقین کامل (دینی موضوع) (۹) فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ۔ (۱۰) ایمانی شہ پارے (مرتب کردہ) (۱۱) باتیں ہماری رہ گئیں (مرتب کردہ)

شاعری میں مرثیہ ساحرؔ صاحب کا خاص موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر تخلیقات مراثی کی صورت میں ہیں۔

خانوادہ اجتہاد برصغیر پاک وہند کا ایک ایسا علمی و دینی خاندان ہے جس کے علماء نے جہاں مذہب کی خدمت کی ہے وہاں شعراء نے گلستان شعری اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے۔ اسی خانوادے کے مرثیہ گو شعرا کا تعارف ساحرؔ صاحب کی تازہ کتاب کا موضوع ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے آغاز میں خانوادہ اجتہاد کے بانی حضرت غفران مآبؒ کا شجرہ طیبہ دیا ہے۔ پھر اردو مرثیہ کے عنوان سے صنف مرثیہ کے بارے میں اہم علمی اور فنی نکات کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد خاندان اجتہاد کا تعارف تحریر کیا ہے اور اس خاندان کی علمی و ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ پھر خانوادہ اجتہاد میں شاعری کا آغاز اور آخر میں اصل موضوع خانوادہ اجتہاد میں مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جن اہم مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حضرت ماہر۔ حضرت امیر۔ حضرت فاخر۔ حضرت جاوید۔ حضرت ذاخر۔ حضرت خورشید۔ حضرت حسین۔ حضرت شاعر۔ حضرت مہدی نظمی۔ حضرت تاثیر نقوی۔ حضرت افسر اور خود وہ یعنی ساحرؔ لکھنوی شامل ہیں۔ گویا ماہرؔ سے ساحرؔ تک تقریباً ڈیڑھ سو سالہ ادبی تاریخ انہوں نے بیان کر دی ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں خاندان سے متعلق کچھ اہل قلم کے مختصر تذکرے بھی شامل ہیں۔ مثلاً مولوی سید عسکری۔ حضرت اختر۔ حضرت ناظم۔ حضرت عقیل۔ مولوی سید زاہد حسن۔ حضرت فہیم مولانا سبط حسن اور حکیم آشفتہ۔

آیئے اب متذکرہ بالا مرثیہ نگاروں کے اس تذکرے میں سے ان کے فکر و فن کی مختصر جھلکیاں دیکھتے ہیں۔

خلاق معانی حضرت ماہرؔ لکھنوی (نواب مولوی سید مہدی حسین صاحب تخلص ماہرؔ)

۱۲۶۴ھ تا ۱۳۲۵ھ ایک قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے اور زیادہ تر مرثیہ کہتے تھے۔ لیکن غزل میں بھی ان کا خاص انداز تھا۔ نمونے کے طور پر ایک شعر دیکھئے۔

حیرت مجھے روانیٔ عمرِ بشر میں ہے
لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

ماہرؔ صاحب کی قادر الکلامی کا ایک نمونہ ان کی وہ رباعی ہے جو انہوں نے وفات سے کچھ دیر پہلے کہی۔

کیوں خوش نہ ہوں دل شاد کیا ہے تو نے
سو فکروں سے آزاد کیا ہے تو نے

آواز سے ہچکی کی یہ دیتا ہوں صدا
حاضر ہوں اگر یاد کیا ہے تو نے

اوراب جناب قاسم کے حال میں ۵۰۰بند پر مشتمل ان کے مرثیے سلطان العراقی میں سے ایک بند دیکھئے۔

وہ وقت صبح وہ دریا وہ کشتیوں کا تھماؤ
وہ ناخدا کا یہ کہنا یہی رہے برتاؤ
ولی ولی کا وہ غل وہ خلاصیوں کا جماؤ
علی علی وہی پھر، ہاں نکل چلی ہے ناؤ
عیاں ہے سب پہ جو حیدر میں زوریاری ہے
وہ ورتھا کون سا جس پر سے فوج اتاری ہے

حضرت اُمید لکھنوی (سید محمد جعفر امید) ۱۲۲۵ھ تا ۱۲۹۳ھ

جناب معصومہ قسم کے حال میں ان کے ایک مرثیہ کے چہرے سے ایک اقتباس پیش ہے۔

فکر ثنائے مشہد ذی احترام ہے
وصفِ ریاض روضہ رضوان مقام ہے
ہر فرد رشکِ گلشن دارالسلام ہے
ایک ایک بیت قدر میں بیت الحرام ہے
خامہ کا رکنِ خانہ کعبہ خطاب ہے
پانی نہیں دوات میں زمزم کا آب ہے

حضرت فاخر اجتہادی لکھنوی (نواب مولوی سید اصغر حسین فاخر)

ولادت ۱۸۵۱ء وفات ۱۹۰۹ء

انہوں نے بے شمار مرثیے کہے اور ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔

ایک مرثیے سے رات کا منظر دیکھئے۔

تاج زر بیر فلک نے جب اتارا سر سے
فوج انجم ہوئی برگشتہ شہ خاور سے
ہو گئی محو شفق بھی فلک اخضر سے
چادر سرخ ہٹی روئے مہہ انور سے
چاندنی چھٹکی زمیں نور سے معمور ہوئی
چشم مہتاب و کواکب کی رمد دور ہوئی

حضرت جاوید اجتہادی لکھنوی (مولوی سید محمد کاظم عرف بندے کاظم) ۱۸۶۴ء تا ۱۹۲۱ء

اپنے وقت کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔

ان کے ایک مرثیے کے چہرے کا ایک بند پیش ہے۔

کون دنیا میں نہیں آج ثنا خواں مرا
بس کہ جو دل میں رہے وہ نہیں ارماں میرا
دہر کی تیز ہوا سے نہیں نقصان میرا
منہ چھپا لے گا چراغ تہہ داماں میرا
سوزِ غم بھی سبب کارِ نمایاں ہو جائے
یوں نفس ہو تہہ و بالا کہ چراغاں ہو جائے

وحیدِ ہند حضرت ذاخر اجتہادی لکھنوی ۱۲۸۸ھ تا ۱۳۵۳ھ

(مولوی سید فرزند حسن ذاخر)

انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن مرثیے پر خاص توجہ تھی۔ ایک مرثیے میں منظر نگاری کا انداز دیکھئے۔

جب انتہائے شام مصیبت گزر گئی
بیتا بیوں کی ملک عدم تک خبر گئی
ٹھنڈی ہوا سے یوں تپ فرقت اتر گئی
جو دل کی آگ تھی وہ چراغوں کے سر گئی

حدت جگر کی لعلِ سرتاج ہو گئی
شعلے کو کوہ طور پہ معراج ہو گئی

حضرت خورشید اجتہادی لکھنوی ۱۲۷۴ھ تا ۱۳۱۹ھ

مولانا سید محمد مصطفیٰ عرف مولوی لڈن صاحب انہوں نے کم و بیش پچاس مرثیے کہے۔

ایک مرثیے میں سے گھوڑے کی تعریف میں ایک بند پیش ہے۔

وہ جھوم جھوم کے چلتا تھا چال مستانہ
ہر ایک دیدہ گلگوں تھا مے کا پیمانہ
نہ کیوں ہو دیکھنے والے کا قلب پروانہ
شرارت اس میں تھی مثل نگاہ جانانہ
کلیجے ٹکڑے تھے عشاق کے کتاں کی طرح
ہزار رنگ بدلتا تھا آسماں کی طرح

حضرت حسین لکھنوی

(سید صادق علی عرف جھنگا صاحب) ۱۸۸۰ تا ۱۹۴۰ء

حضرت عباسؑ کے حال میں ایک مرثیے سے صبح کی منظر کشی اس بند میں دیکھئے۔

جب شورِ آمد آمد مہر مبیں ہوا
ہم رنگِ خوں شفق سے سپہر بریں ہوا
کا فورِ صبح غازہ روئے زمیں ہوا
ذرہ ہر ایک غیرت در ثمیں ہوا
بے نور ماہتاب کا خالی ایاغ ہے
ذرہ ہر ایک اب گہر شب چراغ ہے

لسان الشعراء حضرت شاعر اجتہادی لکھنوی ۱۸۸۹ تا ۱۹۵۷ء

(مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب قبلہ) ہر صنف سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن مرثیہ گوئی خاص میدان تھا۔ "مرثیہ اسلام اور مزدور" کے مطلع کا بند ملاحظہ فرمائیں۔

فاقہ کش بھی تھے نبیؐ فاتح و منصور بھی تھے
عزت خاک بھی تھے مطلع و النور بھی تھے
ان کے گھر دولتِ کونین سے معمور بھی تھے
حق کے محبوب بھی تھے خلق کے مزدور بھی تھے
ہو اشارہ تو قمر شق ہو رسالت ایسی
سنگ خندق سے اٹھاتے ہیں مشقت ایسی

انیس عصر حضرت مہدی نظمی اجتہادی لکھنوی ۱۹۲۳ تا ۱۹۸۷ء

(سید ابن الحسن عرف شنے صاحب قبلہ)

ان کے ایک مرثیے میں جناب علی اکبر کے سراپا کا حال اس بند میں ملاحظہ ہو۔

روشن نگاہ جیسے چراغ خدا کی لو
روشن جبیں کہ جیسے مہ و کہکشاں کی ضو
روشن ضمیر خلد میں کوثر کی جیسے رو
روشن دماغ پہ تو خورشید صبحِ نو
نازک ہے جو حسینؑ کے احساس کی طرح
جرار ہے جو حضرت عباسؑ کی طرح

حضرت تاثیر نقوی ۱۹۴۰ تا ۱۹۸۷ء

(سید محمد مہدی مظفر حسن) تمام اصناف سخن میں قادر الکلام تھے لیکن دینی ادب پر ان کی خاص توجہ تھی۔

تمام اصناف سخن میں قادر الکلام تھے۔ دو مرثیے "لب جبریل" اور "آیاتِ حق" مسدس "مولائے کائنات" اور ایک مختصر مرثیہ "صدائے غم" منظر عام پر آچکے ہیں۔

''لب جبریل'' کا مطلع دیکھئے

ہر انقلاب خیر کے بانی حسینؑ ہیں
کردار میں رسول کے ثانی حسین ہیں
محبوبہ ازل کی جوانی حسین ہیں
زندہ ہے جس سے حق وہ کہانی حسین ہیں
مشکل پسندیاں کوئی آسان تو نہیں
کیسے رہیں خموش یہ قرآن تو نہیں

اوراب حضرت عباس کی شان میں یہ بند ملاحظہ کریں۔

وفا کا قلب وفا کا جگر وفا کا ضمیر
وفا کی روح وفا کا لہو وفا کا خمیر
وفا کا ذہن وفا کی نظر وفا کا بصیر
وفا کی سیف وفا کا علم وفا کا امیر
زمین پر ہے وفاؤں کا آسماں عباسؑ
جہاں جہاں ہیں وفائیں وہاں وہاں عباسؑ

حضرت افسر اجتہادی لکھنوی ۱۹۰۶ تا ۱۹۸۵ء
(نواب سید افسر حسین صاحب)

ان کے ایک مرثیے میں تلوار کی تعریف کا ایک بند دیکھئے۔

مجبور ہو کے شاہ نے تلوار کھینچ لی
اٹھی جو ذوالفقار فضا میں لکھا علی
حملہ سے فوج شام میں تھی ایک کھلبلی
اعدا کی موت پھر تو نہ ٹالے سے بھی ٹلی
ناگن تھی ایسی کاٹے کا جس کے جیا نہیں
دشمن کو بھاگنے کا بھی موقع دیا نہیں

حضرت ساحر لکھنوی (ولادت ۱۹۳۱ء) ان کے قلم کو نظم ونثر میں یکساں قدرت حاصل ہے۔ مرثیے کے علاوہ دیگر رثائی اصناف سخن مثلاً سلام نوحہ رباعیات وقطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔لیکن مرثیے میں اختصاص کے حامل ہیں۔خاندان اجتہاد کے آخری مرثیہ گو ہیں۔ ساحر صاحب کی مرثیہ نگاری پر مولانا سید محمد باقر شمس صاحب لکھتے ہیں۔

ساحر لکھنوی کے مرثیے تمہید میں تو جدید مرثیوں کی طرح ہیں۔لیکن انہوں نے اپنے مرثیوں کو مرثیہ باقی رکھا ہے اوران میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو واقعہ کربلا کے متعلق ایک مرثیے میں ہونا چاہئیں ان کے مرثیوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اوراصناف سخن کی طرح ان کا ایسا مرثیہ گو بھی برصغیر میں نہیں ہے۔

نمونہ کلام کے طور پر ایک مرثیے میں رجز کا ایک بند دیکھئے۔

ہم کون ہیں یہ اچھی طرح جانتے ہو تم
آنکھیں تمہارے منہ پہ ہیں پہچانتے ہو تم
اس کے پسر ہیں جس کو نبی مانتے ہو تم
کلمہ اسی کے نام کو گردانتے ہو تم
دنیا میں آج نائب احمدؐ ہمیں تو ہیں
قول نبی سے چوتھے محمدؐ ہمیں تو ہیں

اور مصائب کا ایک بند پیش ہے۔

یہ کس نے آمد قاسم کی مجھ کو دی تھی خبر
کہاں ہے وہ مراد ولہا وہ میرا لخت جگر
یہ کیا ہوا مجھے آتا نہیں ہے کچھ بھی نظر
تڑپ کے بولیں یہ بھاوج سے زینبؑ مضطر
وہ جو میں تن پاش پاش ہے بھابی
وہی تو آپ کے بیٹے کی لاش ہے بھابی

حقیقت یہ ہے کہ دور حاضر میں نسیم امروہوی۔قیصر بارہوی۔وحید الحسن ہاشمی اورشاہد نقوی

کے بعد مرثیہ ان کے دم سے زندہ ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے اور ان کے قلم کی جولانی کو سلامت رکھے۔آمین۔

غرض اس کتاب کی تالیف سے جہاں انہوں نے رثائی ادب کے علمبردار ایک عظیم علمی و ادبی خانوادے کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔وہاں ادبی تاریخ اور تحقیق کا بھی حق ادا کیا ہے۔

شہاب کاظمی کی ادبی کائنات

سید سخاوت احمد شہاب کاظمی کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے۔جو عرصہ دراز سے بیرون ملک قیام پذیر ہیں اور دیار غیر میں مسلسل تصنیف وتالیف کے ذریعے اردو ادب کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں۔اب تک ان کی نو کے قریب تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ترے تیر نیم کش کو (مجموعہ غزلیات)۱۹۸۶ء

(۲) مہر کے پرتو سے (مراثی)۲۰۰۱ء

(۳) یہ خلش کہاں سے ہوتی (نظم وغزل)۲۰۰۱ء

(۴) میری قلمرو سے (کربلائی ادب)۲۰۰۱ء

(۵) کوئی میرے دل سے پوچھے (غزلیات)۲۰۱۰ء

(۶) سودا ہے جواہر کا (مراثی ومسدس)۲۰۱۰ء

(۷) ورق تمام ہوا (حمد ونعت وقصائد)۲۰۱۰ء

(۸) جب تک یہ چمک (قصائد ومناقب اسلام)۲۰۱۰ء

(۹) سرتاپا سخن (تذکرہ)۲۰۱۰ء

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کی تصانیف میں ایک نثری کاوش ہے۔جبکہ باقی آٹھ شاعری پر مشتمل ہیں۔اور ان میں بھی تین نظم وغزل اور پانچ دینی ادب کے مجموعے ہیں۔یوں دینی ادب کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔آئیے اب موضوع وار ان تصانیف کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

غزل ونظم پر مشتمل ان کے تین مجموعے ہیں تیرے تیر نیم کش کو،یہ خلش کہاں سے ہوتی اور

کوئی میرے دل سے پوچھے۔ جو بالترتیب ۱۹۸۶ء، ۲۰۰۱ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں کے نام سے ظاہر ہے کہ شہاب صاحب غالب سے کس قدر متاثر ہیں اور صرف نام ہی نہیں ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی غزل پر بھی غالب کا اثر نمایاں ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ عظیم شعراء کا اثر نہ صرف ان کے معاصرین قبول کرتے ہیں بلکہ ان کے بعد آنے والوں پر یہ اثر اکثر زیادہ ہوتا ہے۔ شہاب صاحب نے اپنی ہر کتاب پر کسی اور سے دیباچہ یا پیش لفظ لکھوانے کی بجائے آغاز میں خود اپنی طرف سے چند صفحات لکھے ہیں۔ جن سے قاری کے لئے ایک تو ان کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرے کسی نقاد کی رائے سے متاثر ہونے کی بجائے اسے براہ راست کلام سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خود ان کا شعر ہے۔

شعر لکھتا ہے جب شہاب کوئی
شعر غالب نظر میں رہتا ہے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ان کی غزل پر غالب کا اثر نمایاں ہے۔ ڈکشن سے لے کر موضوعات تک یہ غزل لہجے میں ترقی پسندوں کے قریب اور رویوں میں ترقی پسندی سے دور اس لئے کہ اس غزل میں روایت کا احترام بھی ہے اور عہد رواں کے تقاضوں کا لحاظ بھی۔

نمونے کے طور پر ان کی غزلوں میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جنہیں با آسانی لحہ حاضر کی غزل کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

بغیر وجہ بھی دیکھی ہے دشمنی ہم نے
ازل سے جیسے دیے کی ہوا مخالف ہے

بکھر جائے نہ رسوائی کی خوشبو سارے عالم میں
ہمارا نام تک اپنے فسانوں میں نہیں رکھنا

راحتیں جب بھی بٹیں گی آسماں سے حسبِ ظرف
نام میرے گردشِ ایام لکھ دی جائے گی

میرا مزاج ناشناس ایک جلا ہوا چراغ
اس کا مزاج آشنا ایک دیا بجھا ہوا

سرِ مژہ نہیں آتے حریت دل کہنے
صدف سے ربط یہ موتی زیادہ رکھتے ہیں

یوں بھی ہو گا قافلہ منزل پہ ہو گا ایک دن
دور منزل سے امیرِ قافلہ رہ جائے گا

کچھ ایسے انقلاب قیادت میں آ گئے
پچھلی صفوں سے لوگ امامت میں آ گئے

دل تو اکثر مجھے اس موڑ پہ لاتا ہے مگر
میرے آنسو مجھے رسوا نہیں ہونے دیتے

رو لئے چشم سوکھی رہی
ہنس دیئے آنکھ تر ہو گئی

میں ہوں صیدِ ناوکِ عاشقی میں شکارِ خنجرِ دوستی
کوئی ہو تو دے مجھے آگہی کہیں اسکی کوئی دوا بھی ہے

روشنی کی خواہش میں گھر جلا نہیں سکتا
تیرگی کے بارے میں سوچتا تو میں بھی ہوں

ہونٹوں سے لے گیا تھا ہنسی تو کوئی رفیق
آنکھوں سے آنسوؤں کی نمی کون لے گیا

ایک ہی تصویر ہے جب تک سلامت ہے ضمیر
ٹوٹ جائے گر یہ آئینہ تو تصویریں بہت

اس کشمکش میں خود سے بیگانے ہو گئے ہم
اپنا خیال رکھنا، ان کا خیال رکھنا

ہم پہ پتھر اچھالنے والا
خود بھی شیشے کے گھر میں رہتا ہے

ان اشعار میں تغزل بھی ہے ترنم بھی اور تفکر بھی ہے اور تدبر بھی ۔غم جاناں کی کسک بھی ہے اور غم دوراں کی دمک بھی ۔

زبان وبیان کے لحاظ سے شہاب کی غزل سادہ مگر پرکار ہے اس میں بول چال کا گداز بھی ہے اور سہل ممتنع کا انداز بھی سہل مرع کی مثال دیکھئے

ٹھہرو رک جاؤ میری بات سنو !
تم سے کچھ کہہ رہی ہے رات سنو !

غالب کی ایک معروف غزل کی تضمین بھی انہوں نے کی ہے ۔ایک شعر کی مثال ملاحظہ کریں

نہ کوئی فریب دینا نہ کوئی فریب کھانا
غم زندگی کا شاید کوئی اور ہے بہانا
کوئی سہل تو نہیں تھا تجھے بات یہ بتانا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

زبان کے معاملے میں انہوں نے کچھ فنی تجربے بھی کئے ہیں ۔مثلاً ان کی ایک غزل مہملہ میں سے دو شعر دیکھئے ۔

دل ول کے یہ قصے وصے بات پرانی ہے
کہو اگر کہنے وہنے کو نئی کہانی ہے

اور

رسوائی کا ڈر ور ہے تو ہونٹ ووٹ سی لیجے
کیوں کہئے سینے ویجے میں درد نہانی ہے

ایسی ایک اور غزل کے دو شعر ہیں ۔

ترک وفا کی قسم وسم سب بھول گئے
شکوے شکایت ستم و تم سب بھول گئے
عشق میں بڑ کر شعر و عر تو الگ رہے
کاغذ واغذ قلم ولم سب بھول گئے

اسی طرح انہوں نے غالب کے علاوہ دیگر معروف اساتذہ کی غزلوں کی توسیع بھی کی ہے جو یقیناً ایک نادر تجربہ ہے ۔توسیع یہ ہے کہ شاعر کے اشعار کا کوئی لفظ چھوٹے نہیں اور ان کی معنویت بھی تبدیل نہ ہو ۔اس سے البتہ بحر بدل جاتی ہے ۔مثال کے طور پر مختلف اساتذہ کی غزلوں میں سے ایک ایک شعر کی توسیع دیکھئے ۔

(بتا ہم کو) دل ناداں تجھے (صدمہ) ہوا کیا ہے؟
(علاج اس کا ہے کیا) اس درد کی آخر دوا کیا ہے؟

(غالب)

(وائے حسرت) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
(اور بیٹھے) ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

(غالب)

ہے تنگ ظرفوں کو بے جا (اشتیاق) مے کشی
جام مے (کا ہم صفت) کب ہو سکے جام حباب

(سودا)

تہمت چند اپنے ذمے (دیکھئے ہم) دھر چلے
جس لئے آئے تھے (اس دنیا میں) ہم سو کر چلے

(درد)

(لحہ لحہ) قافلے میں صبح کے اک شور رہے
یعنی غافل ہم چلے (تو اب تلک) سوتا ہے کیا؟

(میر)

(چہرہ) ہے (کہ) ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو ذرا تہِ نقاب کیا ہے

(مصحفی)

بیت ہیں (میرے کہ ہیں) دوابروئے زیبائے یار
مصرع برجستہ ہے (میرا قد) بالائے یار

(آتش)

(یہ) وقت پیری (میں عہد) شباب کی باتیں
(یہ باتیں) ایسی ہیں جیسی (کہ) خواب کی باتیں

(ذوق)

وعدہ وصلت سے (اپنا) دل (بھلا) ہو شاد کیا
(اور) تم سے دشمن (جاں) کی مبارک باد کیا

(مومن)

غزل کے علاوہ شہاب صاحب نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں جو ان کے مجموعوں میں موجود ہیں ۔ان نظموں کے موضوعات زیادہ تر سیاسی اور سماجی ہیں ۔مثلاً وطن ۔کرسی ۔موسم کے شب و روز اور تلقین وغیرہ ۔اس کے علاوہ مختلف شخصیات کے لئے قطعہ ہائے تاریخ بھی انہوں نے کہے ہیں ۔جو ان کی قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

غزل و نظم کے مجموعوں کے علاوہ شہاب صاحب کی کائنات شعری میں ان کے پانچ ایسے مجموعے ہیں جو دینی ادب پر مشتمل ہیں ۔یعنی حمد و نعت ۔منقبت ۔سلام ۔نوحے اور مرثیے اور یہی ان کی شاعری کا غالب حصہ ہے ۔ان کی دینی شاعری پر فکری اور فنی لحاظ سے میر انیس اور علامہ اقبال کے اثرات گہرے ہیں ۔ان کے مراثی کا پہلا مجموعہ "مہر کے پرتوے" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا ۔جس میں ان کے بارہ مرثیے شامل ہیں ۔جن کی تفصیل کچھ یوں ہے ۔

(۱)	زمین کی زبانی ۱۹۸۵ در احوال کربلا و حضرت عباس علمدارؑ	تعداد بند ۹۶
(۲)	آشوب ہنر ۱۹۹۰ء در احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۰
(۳)	سفر ۱۹۹۲ در احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۶
(۴)	درس حیات سفر ۱۹۹۴ در احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۲
(۵)	گفتگو ۱۹۹۵ در احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۱۴
(۶)	آگہی ۱۹۹۶ در احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۴۰
(۷)	زخم انا ۱۹۹۷ در احوال کربلا و جناب قاسم بن حسنؑ	تعداد ۱۳۵
(۸)	مباہات ۱۹۹۹ در احوال کربلا حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۲۷

اس کے علاوہ سوز خوانی کے لئے چار مختصر مرثیے جناب امیرؑ ، جناب علی اکبرؑ، جناب علی اصغر اور جناب عون محمد کے حال میں ہیں ۔

اس مجموعے کے بعد "سودا ہے جواہر کا" نام سے ان کے مراثی و مسدس کا ایک مجموعہ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ جس میں ان کے پانچ مرثیے شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) تلخابۂ حق ۲۰۰۲ء دراحوال رہائی اہلِ حرم تعدادِ بند ۱۱۲

(۲) اذانِ حریت ۲۰۰۲ء دراحوال جناب حر ریاحی تعدادِ ۱۳۷

(۳) خود تخمی ۲۰۰۸ء دراحوال حضرت امام حسینؑ تعدادِ ۱۶۳

(۴) مرسلؑ و شبیرؑ ۲۰۰۹ دراحوال حضرت امام حسینؑ و نعت سرور تعدادِ ۱۰۴

(۵) جلوۂ دل ۲۰۰۹ء دراحوال حضرت عباس علمدارؑ تعدادِ ۸۴

ان کے علاوہ پانچ مختصر مسدس ہیں جو اسیری اہل حرم، آمدِ زوجۂ حر جری، چودہ سو سالہ جشن حضرت عباسؑ، الوداع محرم و ولادت مولائے کائناتؑ کے موضوع پر ہیں۔

ان مراثی میں ہمارے رثائی ادب کی سب سے محکم روایت دبستان انیس کی مکمل پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید مرثیے کے مزاج کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ شہاب صاحب چونکہ خود لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے زبان کی سلاست اور فصاحت کے اعتبار سے انہیں استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اور جہاں تک بیان کی بلاغت کا تعلق ہے۔ قادرِ مطلق نے انہیں اس میدان میں بھی قدرت کلام عطا کی ہے۔ پھر رثائیت کی روح بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ اس لئے اگر ہم انہیں دورِ حاضر کے ایک ممتاز مرثیہ نگار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نمونے کے طور پر ان کے مراثی میں سے چند اقتباسات دیکھئے۔

مرثیہ زمین کی زبانی سے حضرت عباسؑ کی شہادت پر ایک بند پیش ہے۔

خوں بہہ رہا تھا جسم غضنفر سے بے حساب
پر تھا نہ شمہ بھر میں دلاور کو اضطراب
گھائل ہوئی جو تیروں سے ناگاہ مشک آب
دیکھی ہے میں نے پاؤں سے چھٹتے ہوئے رکاب
زیں پر سنبھلنا شیر کو دشوار ہو گیا
حسرت اثر نوشتۂ دیوار ہو گیا

"آشوبِ ہنر" میں سے حضرت امام حسینؑ کی شان میں ایک بند

جو عرشِ بندگی کا ستارا تھا وہ حسینؑ
سجدوں کو بوجھ جس کا گوارا تھا وہ حسینؑ
جس کو خدا کے دین نے پکارا تھا وہ حسینؑ
امت کا آخری جو سہارا تھا وہ حسینؑ
ظلمت کی آندھیوں میں جو تنہا چراغ تھا
شاداب جس کے دم سے شریعت کا باغ تھا

"سفر" میں سے ایک بند پیش ہے

بیعت سے جب حسینؑ نے انکار کر دیا
اظہار برہمی سر دربار کر دیا
عزمِ بقائے دین کا اظہار کر دیا
اعلانِ جنگ کفر سے اک بار کر دیا
دن نیک تھا نہ سال نہ ساعت سعید تھی
پہلے محاذ پہ یہ شکست یزید تھی

"درسِ حیات" کا ایک بند دیکھئے۔

جس کی رگوں میں حق تھا رواں خون کی جگہ
جس کی جبیں پہ نورِ نبیؐ کو ملی جگہ
جس کو خدا نے مہرِ رسالت پہ دی جگہ
قبروں کی جس نے اپنے لئے مول لی جگہ
کل جس پہ منکشف تھی کسی راز کی طرح
انجام جانتا تھا جو آغاز کی طرح

"آ گہی" میں سے ایک بند پیش ہے

صبر و رضا کا منبع و مصدر ہے آ گہی
جو دوستی کے باب کا دفتر ہے آ گہی
آئینہ حیات کا جوہر ہے آ گہی
ابتر ہے جہل سورہ کوثر ہے آ گہی
پیش خدا جھکا ہوا سر آ گہی سے ہے
ہر شے کا اعتبار نظر آ گہی سے ہے

"تلخابۂ حق" میں رہائی اہل حرم کا ذکر ایک بند میں دیکھئے۔

تیرہ مہینے قید میں جب ہو گئے تمام
جو رو جفاء و غیظ و غضب ہو گئے تمام
ایذا رسی کے سارے سبب ہو گئے تمام
ارمان انتقام کے سب ہو گئے تمام
کچھ ایسے وسوسے دل قاتل میں آ گئے
اہل حرم رہائی کی منزل میں آ گئے

"اذانِ حریت" میں جناب حر ریاحی کے حال میں ایک بند پیش ہے۔

تو خاک سمجھ پائے گا کیا پایا ہے حُر نے
اک چشم تلطف سے خدا پایا ہے حُر نے
کی تھی جو خطا اس کا صلہ پایا ہے حُر نے
مطلب تجھے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے حر نے
مختار ہوں میں اپنا بھلا دیکھ رہا ہوں
اب آنکھ کھلی ہے تو سوا دیکھ رہا ہوں

اوراب مختصر مرثیوں میں سے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

مولائے کائنات کی رخصت کا وقت ہے
زہرا کی دختروں میں قیامت کا وقت ہے
شیعوں پہ یہ شدید مصیبت کا وقت ہے
یعنی غروب مہر امامت کا وقت ہے
جراح کہہ رہے ہیں کہ بچنے کے اب نہیں
یہ رات بھی علیؑ پہ نہ گزرے عجب نہیں

شہاب صاحب کی مسدسوں میں سے کچھ بند دیکھئے۔اسیریٔ اہل حرم کے احوال میں ایک بند۔

جب شام غریباں کی سحر ہو گئی بن میں
جکڑی گئیں تطہیر کی آیات رسن میں
اولاد نبی قید ہوئی تازہ محن میں
ویرانی سی ویرانی تھی زہرا کے چمن میں
نشہ نہیں اترا تھا ابھی شوق جفا کا
وعدہ ابھی باقی تھا محمدؐ سے وفا کا

چودہ سوسالہ جشن حضرت عباسؑ کے سلسلے میں ایک مسدس کا بند ہے۔

چودہ سو برسوں سے یاد ان کی مناتے آئے ہیں
شہ نشین دل پہ ہم ان کو بٹھاتے آئے ہیں
جذبہ شوق نہایت آزماتے آئے ہیں
اپنی قسمت اور دنیا کو جگاتے آئے ہیں
ان کے پرچم کو اٹھانے میں ستم سہتے رہے
دار پر بھی داستانِ کربلا کہتے رہے

اور ولادت مولائے کائناتؑ کے سلسلے میں ایک بند ہے۔

تیرہ رجب کی آج زمانے میں دھوم ہے
گیتی پہ ساکنان فلک کا ہجوم ہے
دیکھو جدھر عنایت حق بالعموم ہے
رخصت کے بندوبست میں بادِ سموم ہے
تقدیر بن گئی ہے نسیم بہار کی
مدت ہے اختتام پہ اب انتظار کی

مراثی اور مسدس کے علاوہ دینی ادب میں شہاب صاحب نے حمد۔نعت۔منقبت۔سلام اور نوحے بھی لکھے ہیں۔اور میری قلمرو سے ورق تمام ہوا اور جب تک یہ چمک اس سلسلے میں ان کے مجموعے ہیں ان منظومات میں بھی متعلقہ موضوع کے تقاضوں کو انہوں نے پورے رکھ رکھاؤ سے نبھایا ہے اور زبان وبیان کی سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ فکر وفن کی لطافت اور بلاغت یہاں بھی ان کا اختصاص ہے۔گویا ان کی یہ شاعری مے ولائے محمد و آلِ محمد سے پوری طرح سرشار ہے۔آئیے اب ان کے دینی ادب میں صنف وار کچھ جھلکیاں دیکھتے ہیں۔

حمد:

حمد جس کی علیؑ ولی نے کی
بندگی جس کی خود نبیؐ نے کی
چاند تاروں نے روشنی نے کی
فکر و وجدان و آگہی نے کی
میں کروں اس کی حمد کیا کہہ کر
جگر آتا ہے منہ کو رہ رہ کر

مناجات

محتاج ہے ہر ایک یہاں تیری رضا کا
دیتا ہے تو ہی اذن بھی نالے کو رسا کا
مانگے کوئی تجھ سے تو نہیں ذل حیا کا
مجھ کو نہ سلیقہ ہے ثنا کا نہ دعا کا
پھیلائے ہوئے ہاتھ مگر مانگ رہا ہوں
میں تجھ سے دعاؤں میں اثر مانگ رہا ہوں

نعت

میرے پیروں میں لغزش نہیں ہے میرا دل بے مثال نگینہ
نقشِ ہائے محمدؐ پہ چل کر میں نے سیکھا ہے دنیا میں جینا

جسم کو روح کی پہچان نہ سمجھا جائے
پیکرِ نور کو انسان نہ سمجھا جائے

دیکھوں ادھر کو اور نہ دیکھوں ادھر کو میں
کر دوں نثار خاک مدینہ پہ سر کو میں

کوئی دن تو مرا ایسے بسر ہو
حرم میں شام بطحا میں سحر ہو

نور وہ ہم بشر ہم کہاں وہ کہاں؟
رات ہم وہ سحر ہم کہاں وہ کہاں؟

نبی کی چاہ میں جس دن سے کھو گیا ہوں میں
بلند اپنی نگاہوں میں ہو گیا ہوں میں

منقبت

یہ عقیدہ ہی نہیں ہے تجربہ بھی ہے شہاب
جب لیا نام علی حاصل توانائی ہوئی
(قصیدہ جناب امیرؑ)

ثنائے پنجتن وہ قلزم زخار لگتا ہے
جہاں پہ ڈوبنے والے کا بیڑا پار لگتا ہے
(قصیدہ غدیر خم)

محفل میں چھڑ گئی تھی ذرا روشنی کی بات
کیسے مری زباں پہ نہ آتی علی کی بات
(منقبت مولا علیؑ)

اسلام کا ثبات ہیں شیر خدا علیؑ
تقدیر شش جہات ہیں شیر خدا علیؑ
تعبیر ممکنات ہیں شیر خدا علیؑ
مولائے کائنات ہیں شیر خدا علیؑ
(منقبت مولائے کائنات)

جنابِ فاطمہ زہرا کی مدحت کس کے بس میں ہے؟
قلم لکھے کوئی قرآں کی سورت کس کے بس میں ہے؟
(منقبت جناب فاطمہ زہراؑ)

کرب و بلا تو صلح سے آگے کی بات ہے
باطل کا انہدام امام حسن سے ہے
(منقبت امام حسنؑ)

سر ہے مرا اور حضرتِ شبیر کا در ہے
منزل پہ ہوں میں اور ابھی رستے میں خضر ہے
(قصیدہ امام حسینؑ)

پیدا ہوں قیامت کے آثار تو اچھا ہو
آ جائیں کسی صورت سرکار تو اچھا ہو
(منقبت امام عصرؑ)

سلام

حسینؑ ابن علی نے تیغ اٹھا کے کر دیا ثابت
خلاف ظلم جو اٹھے اسے شمشیر کہتے ہیں

سیاہی سوختہ خیموں کی رنگ خون صغیر
مدام چاہئے تصویر کربلا کے لئے

لوگ جینے کے لئے مشتاق یوں ہوتے نہیں
جسقدر بیتاب تھے قاسم قضا کے واسطے

اس کے آگے خلد کی خوش منظری کا ذکر کیا
جس کی اک ساعت بھی دید قبر سرور میں کٹی

ابھی تو شیر کو رن کی رضا بھی دی نہیں شہؑ نے
سمیٹے پھر رہے ہیں کس لئے جبریلؑ شہپر کو

رشتہ ہے میری روح کا جب تک بدن کے ساتھ
اللہ میرے ساتھ ہے میں پنجتن کے ساتھ

سایہ خیر البشر جس دن سے اٹھا تھا شہاب
تھی اسی دن سے تمام آل پیمبرؐ دھوپ میں

نوحہ

سن کر یہ نوحہ شاہ کا ہاتف نے دی بڑھ کر صدا
اے میر دشت نینوا و احسرتا واحسرتا

عباس کہاں ہو مرے عباس کہاں ہو
رہ رہ کے بلاتی ہے بہن دیر سے تم کو

قطعات

مرتبہ کس کو یہ حاصل ہے سوائے زینبؑ
دیتی تھیں حضرت شبیر کو رائے زینبؑ
بعد قتل شہ دیں بھی نہ رکے ظلم مگر
راہِ حق سے نہ ہوئی جنبش پائے زینبؑ

دل کو وارفتہ دنیا نہیں ہونے دیں گے
سر میں اغیار کا سودا نہیں ہونے دیں گے
میرا ایمان ہے اس پر کہ سر حشر شہاب
میرے مولا مجھے رسوا نہیں ہونے دیں گے

اور اب آخر میں ذکر کرتے ہیں شہاب صاحب کے اس نثری شاہکار جوان کا ترتیب دیا ہوا وہ منفرد تذکرہ ہے جسے "سرتا پا سخن" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں متعدد اساتذہ سخن کے

کوائف واحوال ہیں۔مگر نمونہ کلام میں ایسے اشعار دیئے گئے ہیں جن میں جسم انسانی سے متعلق اعضا مثلاً آنکھ۔لب۔عارض۔گردن وغیرہ اوران کے ملحقات بطور ردیف استعمال ہوئے ہیں۔ شعرا کا ذکر تخلص کی بنیاد پر حروفِ تہجی کی مناسبت سے ہے۔قدما میں ولی اور متاخرین میں جلال کا ذکر سن ولادت ووفات کے علاوہ ان کے شاگردوں کا بھی ذکر ہے۔کتاب کے آغاز میں اردو تذکرہ نویسی کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔پھر فہرست تذکرات اور تفصیلات شعراء کے ساتھ ساتھ جواز تذکرہ اور کچھ شعر گوئی کے بارے میں نکات بیان کئے گئے ہیں۔شہاب صاحب کی یہ کاوش علمی تاریخی اور تحقیقی نوعیت کی ہے اور بیش قیمت علمی اور فنی معلومات سے پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب شہاب کاظمی کی ادبی شخصیت ایک آفتاب روشن کی مانند ہے۔جس کے گرد ان کی تصانیف گردش کرتے ہوئے سیاروں کی طرح ہیں۔یوں ان کی یہ ادبی کائنات لفظ و معنی کی ایسی وسیع کائنات ہے۔جس کا نور دنیائے ادب کو ہمیشہ منور و درخشاں رکھے گا۔ہماری دعا ہے کہ وہ اسی طرح چاردانگ عالم میں اپنے فکروفن کی روشنی پھیلاتے رہیں۔آمین۔

ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟

انسان کو عموماً حیوان ظریف کہا گیا ہے۔یہ حس مزاح ہی ہے جو انسان کو عام طور پر تمام حیوانوں سے امتیاز بخشتی ہے۔قدرت نے انسان یعنی حیوان ظریف یا حیوان ناطق کو ہنسنے مسکرانے کی خاصیت عطا کرکے اسے تمام مخلوقات میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ہنسنا ہنسانا انسانی ذہانت کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مسکراہٹ انسان کے لئے فطرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔کہ یہ ہمارے زخموں کا مرہم اور دکھوں کا علاج ہے۔

دنیائے ادب میں بھی مزاح کی حیثیت واہمیت ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔چنانچہ کسی بھی زبان کا معیاری اور صحت مند ادب خالص مزاحیہ تحریروں سے خالی نہیں ملے گا۔بلکہ بعض اوقات ایسی تحریریں ہی اس کے لئے سرمایہ افتخار وامتیاز ہوتی ہیں۔

ہمارے یہاں اردو ادب کا دامن بھی مزاح کے سدا بہار شگفتہ رنگوں سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ سے لے کر شوکت تھانوی تک اور پطرس بخاری اور شفیق الرحمٰن سے مشتاق احمد یوسفی تک ہر دور میں مزاح کے رنگا رنگ پھولوں نے ہمارے ادب کو منور اور معطر رکھا ہے۔

مرحومہ پروفیسر خورشید جہاں کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل کتاب ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟'' اسی رنگ وخوشبو کی حامل ہے۔جس میں ان کے چودہ مضامین ......''من کہ''......''اعجاز ے''......ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟......ٹائم باڈ پر دوش......نیاپے سکیل......میری قدر...... شوگر نامہ......قرض کی پیتے ہیں......دام تمنا......کٹے زندگی مستی سے......سنئے کہ نہ سنئے......وہ

ایک دن ...... بچت کے ہاتھوں ...... اور مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا'' شامل ہیں۔

کتاب کے آغاز میں مصنفہ مرحومہ کے شوہر نامدار ڈاکٹر جلیل اشرف نے ''دو حرف'' کے عنوان سے چند سطور لکھی ہیں۔ بقول ان کے ''مرحومہ نے جو کچھ لکھا ہے ان کے اپنے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو تلخ ہیں۔ لیکن انہیں قابل قبول بنانے کے لئے انشائیے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔''

معروف مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے پیش لفظ ''دروازہ خاور کھلا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ وہ خواتین کے لکھے ہوئے مزاح کو بیگماتی مزاح کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مرحومہ کے مزاح میں ملائمیت نسبتاً زیادہ ہے اور اس ملائمیت کو نبھانے کا سلیقہ بھی شاید انہی کا حصہ ہے۔ خورشید جہاں کا مزاح بھی ان معنوں میں بیگماتی مزاح ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ موصوفہ طنز نہیں فرماتیں۔ وہ صرف دل بہلاتی ہی نہیں دل دکھاتی بھی ہیں اور اس رویئے میں بھی اس بات کی احتیاط ملحوظ رکھتی ہیں کہ دل صرف اتنا دکھے کہ چیخ نہ جائے۔ وہ نشتر زنی نہیں فرماتیں۔ صرف نوک قلم چھو کر بتاتی ہیں کہ مواد فاسد کہاں ہے؟ وہ ہلکی سی چٹکی بھی لیتی ہیں۔ تو ٹیس نہیں اٹھتی۔ صرف کسک کا لطف انگیز احساس ہوتا ہے۔''

کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے ممتاز نقاد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں۔

''ظرافت اگرچہ خوش رنگ لبادہ ہے تو طنز کڑوی گولی اور نیم کی بنولی ہے۔ طنز کے باعث تلخی سہی۔ مگر طنز نگار تلخی کو خالص صورت میں بیان کرنے کے برعکس مزاح سے ذائقہ خوشگوار بنا کر قاری کے لئے اسے زود ہضم بنانے کی سعی کرتا ہے۔ ہماری تنقید میں طنز و مزاح مترادف کے طور پر سمجھے جاتے ہیں اور یوں دونوں کے جداگانہ کردار کو یکساں قرار دیتے ہوئے ان میں وحدت پیدا کر دی جاتی ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''ہر چند مزاح اور طنز سماجی رویئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دونوں جداگانہ نوعیت اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک تحریر میں یہ دونوں رنگ آمیزی کر رہے ہوں۔ مزاح کم کم بادو باراں کی مانند اور طنز کیکٹس کی صورت میں، ادبی تحقیق

میں ژرف نگاہی سے کام لینے والی خورشید جہاں طنز میں بھی باریک بینی کا ثبوت دیتی ہیں۔ مگر اس میں بھی دوسروں کے بجائے خود کو ہدف قرار دے کر اپنے قلم سے خود پر چاند ماری کی ہے۔ جو آسان نہیں۔ خورشید جہاں کے طنز میں یہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ اپنی ذات کو موضوع اور مرکز ہدف بنانا ہی مشکل کام ہے۔ کہ ذات کے تذکرے میں اگر ایک انتہا پر تعلّی ہے تو دوسری پر خود ترسی۔ اور ان دو انتہاؤں کے درمیان عمل اور ردِ عمل کے متنوع اسالیب۔''

اب آیئے کتاب کی طرف .... پہلا مضمون ہے۔ ''من کہ''۔ جس میں ایک مڈل پاس بیوی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا دلچسپ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں جہاں ہمارے امتحانی نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ وہاں کالجوں میں تدریس کے گھسے پٹے انداز پر خوب لے دے کی گئی ہے۔

''اعجاز مخ'' ...... میں ہمارے نظام امتحان اور اس میں ایگزامینر کے رول کے حوالے سے رازہائے درون خانہ پر سے نہایت فنکارانہ انداز میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟'' ...... میں ہندوستان کے کالجوں میں ہندی زبان کے مقابلے میں اردو کے طالب علموں کی ذہنی حالت زار کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

''ٹائم باؤنڈ پروموشن'' ...... ایک پی ایچ ڈی استاد کی ترقی (پروموشن) کا شگفتہ تذکرہ ہے۔ تو ''نیا پے سکیل'' ایک تنخواہ دار ملازم کے خوابوں کا گوشوارہ 'میری قدر' میں معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں کا شگفتہ انداز میں ذکر ہے تو ''شوگر نامہ'' ذیابطیس کے مریض کی لطیف آپ بیتی۔

''قرض کی پیتے ہیں'' ...... میں قرض لینے اور قرض دینے کے نئے فلسفے پر اچھوتے اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلے میں ''دام تمنا'' اور کٹے زندگی مستی سے اس موضوع پر دلچسپ تحریریں ہیں۔

''سنئے کہ نہ سنئے'' ...... میں باتونی لوگوں اور خاص طور پر شاعروں کی ایک قسم کا پر لطف تذکرہ ہے۔ جو زبردستی ہر کسی کو اپنا کلام سنواتے ہیں۔

"وہ ایک دن"...... شوہروں اور بیویوں کے فرائض کے سلسلے میں ایک اچھوتے موضوع پر مبنی ہے۔ اس میں ہفتے کے ایک دن فریقین کے مقررہ فرائض الٹ جاتے ہیں۔ اس طرح جو مضحکہ صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ اسے نہایت خیال انگیز اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

"بجٹ کے ہاتھوں"...... میں بجٹ کے مختلف طریقے بیان کرتے ہوئے مصنفہ کو بجٹ کے ہاتھوں ہی لٹتا دکھایا گیا ہے۔ جس میں زبردست طنز پوشیدہ ہے۔

"مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا" میں حلقۂ احباب کی بے دریغ وسعت اور مروت بیان کرتے ہوئے عاشق نما بھائی اور بھائی نما عاشق کے دلچسپ کردار پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔

مرحومہ خورشید جہاں پیشۂ تدریس سے وابستہ تھیں اور ان مضامین میں انہوں نے زیادہ تر اپنے پیشے سے متعلق موضوعات مثلاً نظام امتحان۔ کلاس روم اور ایگزامینر شپ وغیرہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ گویا اپنے اردگرد کی حقیقی زندگی ان کا موضوع ہے اور موصوفہ کے تیز مشاہدے اور گہرے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مضامین میں صداقت اور اخلاص کا پہلو نمایاں ہے۔ زندگی کے ٹھوس تجربات اور حقائق نے انہیں جو شعور اور ادراک بخشا ہے۔ اس کی جھلک ان کے تقریباً ہر مضمون میں نظر آتی ہے۔

آخر میں ہر تحریر قاری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ چھوڑ جاتی ہے اور یہی سوچ ان مضامین کی خصوصیت ہے۔ دلچسپی کے لحاظ سے تمام مضامین اول تا آخر قاری کو اپنی گرفت میں لئے رکھتے ہیں۔ جو ان تحریروں کی کامیابی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

خورشید جہاں کا اسلوب تحریر عام طور پر سادہ اور مختصر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں ایک بے تکلفی اور بے ساختگی کی فضا ہے۔ پھر ان کے مضامین میں ایک سا موضوع ہونے کے باوجود یکسانیت نہیں۔ بلکہ ایک تنوع ملتا ہے۔ جو پڑھنے والے کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر کوئی مضمون نگار اپنی تحریروں میں صرف اور صرف مزاح اجاگر کرنے کی کوشش کرے تو خدشہ ہے کہ اس میں کہیں پھکڑ پن پیدا ہو جائے۔ اسی طرح اگر وہ مضامین میں فلسفہ آرائی اور خیال انگیزی سے کام لے۔ تو اس کی تحریریں یبوست کا شکار ہو سکتی ہیں۔ لیکن خورشید جہاں کے یہاں ایسا بالکل نہیں۔ ان کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی ہلکی آمیزش بھی ہے اور اسی توازن کے باعث ان کے مضامین میں دلچسپی اور شگفتگی کا عنصر پوری طرح قائم ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

ان مضامین میں وہ موضوع سے متعلق دلچسپ تفصیلات اس انداز سے بیان کرتی ہیں کہ یہ جزئیات نگاری قاری کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے موضوعات اگرچہ زیادہ تر ذاتی ہیں لیکن اپنے دلچسپ اسلوب کی .... وہ عام قاری کے لئے بھی باعث لطف ہیں۔

ان مضامین کو کتاب میں انشائیوں کا نام دیا گیا ہے۔ جو محل نظر ہے۔ کیونکہ صنف انشائیہ اردو ادب میں اب اس مقام پر ہے کہ انہی خصوصیات کی بنا پر اسے دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ انشائیے کی بہت سی صفات اپنے اندر رکھنے کے باوجود ہم انہیں خالص انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں ان میں انشائیے کی کچھ کچھ جھلکیاں ضرور موجود ہیں۔ درحقیقت یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھے ہوئے مصنفہ کے ایسے فکاہیہ مضامین ہیں جن میں مزاح بھی ہے اور طنز بھی۔ دلچسپی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ انبساط بھی ہے اور فکر بھی اور یہی ان مضامین کی انفرادیت ہے۔ الغرض ہمارے عہد کے شگفتہ اور لطیف ادب میں خورشید جہاں مرحومہ کی یہ کتاب ایک خوبصورت اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

اشکِ دوام

اردو میں مرثیہ نگاری کی تاریخ ہر عہد میں تر و تازہ رہی ہے اور ادبی دنیا پر ہمیشہ اپنے دیرپا اور مثبت اثرات چھوڑتی رہی ہے۔ مرثیہ کی صنف کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ اس نے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور اپنے زمانے کے اجتماعی مزاج کو اپنے اندر سمونے کی بلیغ کوشش کی ہے اور بیش بہا اخلاقی معاشرتی اور مذہبی اقدار کو مسلسل یوں رکھا ہے کہ عہد حاضر بھی اس سے مستیز ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ امر واقعی ہے کہ میر سے لے کر ڈاکٹر ابوالحسن نقوی تک ہر مرثیہ نگار نے سرکار مدینہ نبی کریمؐ اور ان کی آل اطہر کی مدح سرائی کر کے اپنی عاقبت روشن کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ملتان کے رہنے والے ہیں اور بیرون ملک میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہو کر خدمت خلق کر رہے ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور اب ان کا تازہ مجموعہ مراثی ''اشکِ دوام'' مودتِ محمد و آل محمد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ بیرون ملک رہ کر بھی اردو زبان و ادب سے اپنا قلبی تعلق جوڑے ہوئے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ ڈاکٹر صاحب کی جہاں صنف مرثیہ سے عملی دلچسپی کا مظہر ہے۔ وہاں واقعہ کربلا کے فیوض اور حب آل رسول کی برکات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی مرحوم کے تاثرات کے علاوہ ڈاکٹر سید شبیہہ الحسن ہاشمی کا جامع پیش لفظ ''ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے مرثیوں میں عصری حسیت کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ جس میں ہاشمی صاحب نے کتاب میں شامل تمام مرثیوں کا نہایت اختصار لیکن جامعیت سے جائزہ بھی لیا ہے اور دور حاضر کے تائی ادب میں ان تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ''سید وحید الحسن ہاشمی مرحوم ڈاکٹر صاحب کے مرثیوں میں جدید مختصر مرثیے کے تمام لوازمات موجود ہیں اور انہوں نے صنف مرثیہ کو اپنے افکار سے زرخیز کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

نعت شفق

قیام پاکستان کے بعد ادب میں تحریک اسلامی کے زیر اثر جو چند اہل قلم سامنے آئے ۔ان میں لالہ صحرائی مرحوم کا نام اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ انہوں نے آخر دم تک نہایت ثابت قدم رہ کر تسلسل و تواتر کے ساتھ لکھا ۔اس سلسلے میں بیس سے زائد ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں ۔جن میں نثری مضامین اور خاکوں کے علاوہ ان کے نعتیہ مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے ۔ان کی یہ تصانیف جہاں ان کے لئے سرمایہ بخشش ہیں وہاں اردو کے نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں ۔

’’لالہ زار نعت‘‘ سے لے کر’’نعت شفق‘‘ تک ان کے یہاں حب نبی کی روشنی اور سیرت رسول کی خوشبو موجزن محسوس ہوتی ہے ۔ان کی نعت میں عشق سرکار کی سرشاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص احترام کا جذبہ کارفرما ہے ۔اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت نعت میں سیرت خیر الانام کی تبلیغ اشاعت بھی ہے ۔جو دورِ حاضر کی نعت کا ایک خاص پہلو ہے ۔

نعت شفق لالہ صحرائی کا آخری مجموعہ ہے۔جس کا شاید انہیں احساس ہو گیا تھا۔چنانچہ کتاب کے آخر میں ان کی ایک ایسی نعت شامل ہے۔جس میں انہوں نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے ۔اس کا ایک شعر ہے

الوداع کہتا ہوں اب نعت نگاری کو میں
ڈھونڈے گا میرا تہا لفظ بقا میرے بعد

اس مجموعے میں غزلیہ پیرائے کے علاوہ قصیدہ، رباعی، سانیٹ، قطعہ اور ہائیکو کی صنف میں بھی نعت کا بیان ہے ۔جو ایک طرح سے ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے ۔الغرض یہ مجموعہ نعت لالہ صحرائی ایسے محترم بزرگ کا ایک ایسا ادبی تبرک ہے جو اہل دل اور اہل نظر حضرات کے لئے کسی نعت سے کم نہیں ۔

گُماں

’’گُماں‘‘ اُردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر میاں مقبول احمد کا تازہ مجموعہ کلام ہے ۔اس سے پیشتر پنجابی میں ان کے دو مجموعے ’’چھلاں‘‘ اور ’’گلاں‘‘ کے نام سے اور اُردو میں ’’نارسا‘‘، ’’محبس‘‘ اور ’’میں نے کچھ پھول چنے‘‘ منظرِ عام پر آ چکے ہیں ۔’’نارسا‘‘ میں ان کی نظمیں ہیں ۔ جبکہ ’’محبس‘‘ میں غزلیں، اور ’’میں نے کچھ پھول چنے‘‘ میں ان کے شعری تراجم شامل ہیں ۔

’’گُماں‘‘ اس لحاظ سے ان کی منفرد کتاب ہے ۔کہ اس میں ایک ہی مختصر بحر اور ایک سے قافئے ردیف میں یعنی ایک ہی زمین میں ان کی مسلسل پچاس غزلیں شریک ہیں ۔جو بذاتِ خود ایک تجربہ ہے ۔گویا انہوں نے ایک طویل غزل یا دوسرے لفظوں میں پنجاہ غزلہ کہا ہے جو ایک ریکارڈ ہے ۔ان غزلوں میں زمانے کے اعتبار سے کہیں ماضی شکیہ کی فضا ہے اور کہیں مستقبل کی ۔یعنی ایسی فضا ہے جو یقین سے زیادہ گُماں سے قریب ہے ۔اسی لئے غالباً اس کا عنوان ’’گُماں‘ تجویز کیا گیا ہے ۔

ان غزلوں کی زبان رواں دواں، شگفتہ اور سادہ ہے اور ان کا موضوع غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی ۔گویا ان میں تغزل بھی ہے اور تفکر بھی ۔اس لحاظ سے میاں صاحب کا یہ فنی تجربہ جہاں اپنے اندر معنوی وسعت و ندرت اور تازگی لئے ہوئے ہے ۔وہاں اس میں قاری کے لئے ایک دلچسپی بھی ہے ۔

یہ بھی عجیب معطقِ خود سر ہے دوستو!
شہ رگ کے جو قریں ہے وہ دل کے قریں نہیں

ہم جانتے ہیں قصۂ منصور و دار کو
یہ تو اسیرِ گیسوئے جاناں کی بات ہے

ہوتی ہیں چشمِ یار کی فتنہ طرازیاں
کہتا ہے دل کہ گردشِ دوراں کی بات ہے

مومن کی دید میں تو ہے انسان ظہورِ حق
کافر کے ہے گماں میں وجودِ خدا فریب

ہماری توحید کی نظر میں خدا صنم ہے صنم خدا ہے
صنم ہمارے خدا ہمارا، خدا ہمارا صنم ہمارے

بتکدے میں جب گئے لب پہ خدا کا نام تھا
کعبے میں لیتے ہوئے اک بت کا نام آئے ہیں ہم

عشق والوں کا کوئی سجدہ ادا ہو جائے
اتنا خوددار صنم ہو کہ خدا ہو جائے

خزاں کو شوکتِ فصلِ بہار دی ہم نے
جہاں گئے وہی محفل سنوار دی ہم نے

ہم اپنی زیست یہ کہہ کر گزار دیتے ہیں
گزار دینے کی شے تھی گزار دی ہم نے

مرے ایماں کا حاصل بن گیا ہے
خیال ان کا ہی منزل بن گیا ہے

جب الجھتی ہے تو سلجھاتے ہیں زلفِ یار کو
دار پر تجدیدِ رسمِ عاشقی کرتے ہیں ہم

مے خانہ سارا رندِ بلا نوش پی گئے
ہم کو سنا دی کوثر و نہرِ لبن کی بات

بتوں کے عشق میں عشقِ خدا کریں اے قتیل
خدا کے عشق میں عشقِ بتاں کیے جائیں

غرض قتیل جعفری صاحب کی شاعری اپنی سادگی، خلوص اور پیغام کے لحاظ سے ہمارے ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے اور خود قتیل صاحب ہر لحاظ سے ایک مکمل فن کار اور صاحبِ طرز شاعر ہیں جنہیں آج نہیں تو کل ہماری شعری ادبی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

(۱۹۶۱ء)

حرف حرف تیشہ

”حرف حرف تیشہ“ خمار انصاری کا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی غزلیں اور قطعات و رباعیات شامل ہیں۔ پیش لفظ مشفق خواجہ نے لکھا ہے جب کہ فلیپ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اختر انصاری اکبر آبادی کی آرا تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ خود صاحبِ کتاب نے بھی ”حرف آخر“ کے عنوان سے کتاب کے آخر میں شعر و سخن کے بارے میں اپنا نظریہ اور اپنی شاعری کا پس منظر بیان کیا ہے جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ خمار انصاری بقولِ خود اس گروہ بندی، پروپیگنڈے اور جوڑ توڑ کے زمانے میں مزاجاً گوشہ گیر اور کم آمیز انسان ہیں۔ چنانچہ خاموشی سے خدمت شعر و ادب انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ تیس سال سے شعر کہنے کے باوجود

یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں مگر روائت سے ان کا تعلق اتنا ہی ہے جتنا درخت کی شاخوں کا اپنی مٹی سے ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے روائت سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے روحِ عصر کو اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ادب کا زندگی اور کائنات سے جو رشتہ ہے اس کا اظہار ان کے اشعار میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ وہ شاعری کو نری موزونیت نہیں سمجھتے بلکہ حسنِ بیان اور ندرتِ افکار کے بھی قائل ہیں اور شعر ان کے نزدیک روح کی آواز اور دل کی صدا ہے۔

دنیا نے جسے شعر سے تعبیر کیا ہے
وہ روح کی آواز ہے وہ دل کی صدا ہے

یہی روح کی آواز اور دل کی صدا جب حرفوں میں ڈھلتی ہے تو ایک ایک حرف تیشے کا کام دیتا ہے۔ شاعری کوہ کنی کا فرض ادا کرتی ہے اور یوں شعر کا پیکرِ جمیل ظہور میں آتا ہے۔ ”حرف حرف تیشہ“ کا شاعر بھی ایسا ہی کوہ کن ہے جو لفظوں کے پیکر تراشتا ہے۔ بقول مشفق خواجہ ”خمار عام غزل گو شاعروں کی طرح بے روح لفظوں کی دکان نہیں سجاتے۔ انہیں معلوم ہے کہ شاعری میں لفظ کی معنویت اس معنویت سے مختلف ہوتی ہے جو لغت میں نظر آتی ہے۔ وہ ہر لفظ کی روح میں اتر کر لفظ و معنی کے ربط و تعلق کو دریافت کرتے ہیں۔

لفظ جب تک زینت فرہنگ تھا کچھ بھی نہ تھا
فن کی حد میں لفظ کی وسعت کا اندازہ ہوا

اس شعری مجموعے کے مطالعے کے بعد جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خمار انصاری ایک مشاق اور پر گو شاعر ہیں۔ انہوں نے متعدد اور مختلف بحروں میں شعر کہے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں ناہمواری محسوس نہیں ہوتی اور وہ احساس اور خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ذات کے ساتھ کائنات اور غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا ذکر بھی ان کے ہاں ملتا ہے بلکہ یہ رنگ کچھ زیادہ نمایاں ہے چنانچہ اپنے اشعار کے ذریعے انہوں نے اپنے عہد کے آشوب کا جس کامیابی سے

اظہار کیا ہے اس میں حسنِ بیاں بھی ہے اور ندرتِ فکر بھی، ملاحظہ کیجئے، یہ چند اشعار

اشکوں کی قیمت ہی کیا ہے
جھوٹے موتی، ٹوٹے تارے

لوگ پڑھتے ہی نہیں ہیں ورنہ
درد چہروں پہ رقم ہوتے ہیں

شعر وہ شعر ہی نہیں ہے خمار
جس میں عکسِ رخِ حیات نہیں

دل کو یوں چھو کے تری یاد چلی جاتی ہے
جیسے گزرے کوئی رہرو کسی ویرانے سے

اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ چند قطعات ورباعیات بھی شریک ہیں جو شاعری کی ہنر مندی اور فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔مثال کے طور پر ایک قطعہ اور رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

کئی شعلے بھڑک کر رہ گئے ہیں
کئی جگنو چمک کر رہ گئے ہیں
بہت مشکل ہے منزل تک پہنچنا
بہت سے لوگ تھک کر رہ گئے ہیں

اور

احساس میں شعلوں کی لپک ہوتی ہے
آواز میں نیزوں کی کھنک ہوتی ہے
انسان کی عظمت کو جب آتا ہے جلال
یزداں کے سینے میں بھی دھک ہوتی ہے

غرض خمار انصاری کا حرف حرف تیشہ ایک ایسا متوازن شعری مجموعہ ہے جسے آج کے زندگی آمیز ادب میں ایک خوش گوار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

....

اقبال کا تصورِ شاہین

کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا جائے تو تین بڑے ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں۔شباب۔پختہ سالی اور آخرِ عمر لیکن ان تینوں ادوار کی شاعری میں یہ بات حیرت انگیز حد تک مشترک ہے کہ ان کا مخاطب نوجوان ہے اور موضوعِ سخن زیادہ تر شباب اور اس کی مختلف کیفیات ہیں۔نوجوانوں اور زمانہ شباب سے اقبال کی یہ دلچسپی قرینِ فطرت ہے کہ دورِ شباب ہی انسانی زندگی کا زریں دور ہوتا ہے اور کسی بھی انقلاب کی عملی کامیابی کا سہرا بیشتر نوجوانوں ہی کے سر ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن و دل نئے افکار کو سن رسیدہ لوگوں کے مقابلے میں جلد قبول کر لیتے ہیں۔اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو تین جدید تصورات دیئے۔خودی، فقر اور عشق، دوسرے لفظوں میں انہوں نے ان تین الفاظ کو نئے معانی اور مفاہیم عطا کئے۔ان کے نزدیک خودی سے مراد عظمتِ انسانی، فقر سے مراد سیر چشمی اور بے نیازی اور عشق سے مراد گرمیِ دل اور جذبہ کامل ہے۔ان تینوں تصورات کو اقبال ایک مثالی نوجوان کی شخصیت میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہیں۔چنانچہ اس کے لئے وہ شاہین کی علامت استعمال کرتے ہیں۔شاہین ایک سفید فام شکاری پرندہ ہے۔جس میں کچھ ایسی اعلیٰ صفات ہیں جو عام پرندوں میں نہیں۔مثلاً وہ تیز بیں اور بلند پرواز ہے۔کہیں آشیانہ بنا کر نہیں رہتا۔خوددار ہے اپنا رزق خود شکار کر کے کھاتا ہے اور سخت کوش اور سخت جان ہے۔انہی خصوصیات کی بنا پر اُسے

پرندوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں جن تصورات نے علامتوں کا پیکر اختیار کیا۔ ان میں شاہین کا تصور ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر جب یورپ گئے۔ تو ایک عرصے تک انگلستان اور جرمنی میں مقیم رہے اور ان ملکوں کے فکر و فلسفہ کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ خاص طور پر جرمنی کے قیام کے دوران میں انہوں نے جن فکری اثرات کو قبول کیا۔ ان میں معروف جرمن فلسفی نطشیہ کا فلسفۂ قوت و زندگی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ وہ جرمن قوم کی فعالیت اور بلند نظری اور خودشناسی اور خود اعتمادی نے فکرِ اقبال پر گہرے اثرات چھوڑے اور انہی دور رس اثرات کی یادگار وہ فلک سیر پرندہ بھی ہے جسے شاہین کہتے ہیں جو جرمنی کا قومی نشان بھی رہا، چنانچہ یہ بلند پرواز طائر کہیں شاہین اور کہیں شہباز کی صورت میں اقبال کے آسمانِ شاعری پر ہمیشہ محوِ پرواز نظر آتا ہے۔

اس بلند پرواز پرندے کی پہلی جھلک ہمیں اقبال کی شاعری کے اولین دور کی ایک نظم ''مرغ ہوا'' کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اک مرغ سرا نے یہ کہا مرغ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار؟
گر تو ہے ہوا گیر تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحب پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائل پندار
مجروح حمیت جو ہوئی مرغ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی

حد ہے تری پرواز کی لیکن سر دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیں ہے، انہیں گردوں سے سروکار

اس طرح پہلی بار اقبال نے عام پرندوں کے مقابلے میں مرغ ہوا کہہ کر شاہین کا یہ تعارف کرایا ہے کہ وہ خاک نشین ہونے کی بجائے آسمانوں کی وسیع و عریض فضاؤں میں سرگرم پرواز ہے۔ جرمن قوم نے شاہین کو اپنا قومی نشان اس لئے قرار دیا تھا کہ اُس کی نظر میں شاہین کی قوت، تیزی، وسعتِ نگاہ، دور بینی اور بلند پروازی اور شجاعت ایسی عظیم خصوصیات ہیں جو کامیاب انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اقبال کے تصورِ شاہین اور یورپ کے تصورِ شاہین میں یہ فرق ہے کہ اقبال نے شاہین کی مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اسے فقر و درویشی اور خودداری و بے نیازی کی اعلیٰ صفات سے بھی متصف کیا ہے اور یوں اسے مسلمان نوجوانوں کے لئے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے ان کی نظم ''شاہین'' اس کا بہترین ثبوت ہے۔ شاہین کی زبانی اقبال فرماتے ہیں۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری

جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

پرندوں کی دُنیا کے اس درویش بادشاہ پرندے کی زبانی لہوگرم رکھنے کا جس انداز سے ذکر آیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نظامِ حیات میں خونِ گرم ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

لہو یا خونِ گرم اقبال کا وہ مجسم تصور ہے جو اکثر ہمیں ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔لہو میں گرمی بھی ہے اور روانی بھی یعنی حرارت و حرکت جو زندگی کی علامت ہے اور یہی اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وَسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا اُس کو
نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غمِ افلاس

زندہ رہنے کی جدوجہد کے لئے ہمت و جواں مردی کی ضرورت ہے اور ہمت و جواں مردی خونِ گرم کا کرشمہ ہے یہ خونِ گرم حیاتِ انسانی کو جہاں حوصلہ وعزم بخشتا ہے۔ وہاں روحانی بلندیوں سے بھی سرفراز کرتا ہے۔چنانچہ اقبال کا نوجوان جہاں باہمت، جواں مرد بہادر اور سخت کوش ہے۔وہاں وہ اُن روحانی بلندیوں پر بھی فائز ہے۔جن سے مغرب کی مادہ پرست اقوام محروم ہیں۔شاہین سے اقبال کے خطاب کا یہ انداز دیکھئے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاکؑ ہے تو

اور

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس طرح اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کو بلند پروازی کے ساتھ ساتھ فقر وغنا اور بے نیازی کی تعلیم دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ نوجوانانِ اسلام عزت وحمیت اور خودداری کے بے بہا جواہر سے آراستہ ہوں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں، پر اسرارِ شہنشاہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال کا شاہین یا دوسرے لفظوں میں نوجوان جہاں ہمت وقوت، شجاعت وبسالت، بلند پروازی وسخت کوشی اور تیز نگاہی کی صفات رکھتا ہے۔وہاں وہ فقر درویشی اور مکروہات دنیا سے لاتعلقی کی اعلیٰ صفات سے بھی مزین ہے۔اس کی آسمان پر پرواز دراصل اس کی روحانی پرواز ہے۔

جہاں وہ سرورجاودانی اور علوسرمدی کی نئی نئی کیفیات سے آشنا ہوتا ہے۔مثلاً

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب وگِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا
مہر و ماہ ومشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبال کا شاہین اپنے سفلی مقابل کرگس سے سراسر مختلف ہے۔اس لئے کہ شاہین فقر وغنا اور خودی کی بلندیوں پر فائز ہے۔جبکہ کرگس مردار خوری کی پستیوں میں ذلت وخواری کی زندگی پر مطمئن ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

شاہین اور کرگس کے حوالے سے اقبال نے زندگی کے دو متضاد پہلوؤں کا موازنہ پیش کیا ہے۔چنانچہ کرگس کی مادہ پرست اور شکم سیر زندگی کو وہ ذلت وخواری سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی مادہ پرستی اور پیٹ کی غلامی ہے۔جو قوموں کو نہ صرف روحانی طور پر بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی ضعیف سے ضعیف تر بنا دیتی ہے۔جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ایک تمثیل سے اقبال اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مُرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

شاہین کی مثالی علامت پیش کر کے اقبال اپنے نوجوانوں میں حقیقی اسلامی کردار کی عملی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔لیکن صورتِ حال جب اس کے برعکس دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

چنانچہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ دعا آجاتی ہے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدا یا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

شاہیں کے بال و پر دراصل بلند نگاہی ۔قوت و حرکت، سخت کوشی، فقر وغنا اور غیرت و حمیت کی وہ اعلیٰ صفات ہیں۔جن کے ذریعے وہ آسمانی فضاؤں میں بے خوف و خطر محوِ پرواز رہ سکتا ہے۔اقبال چاہتے ہیں کہ ان کی قوم کے شاہینوں میں بھی یہ عظیم خصوصیات پیدا ہوں۔وہ بلند نگاہ ہوں۔یعنی انکے مقاصد عظیم ہوں۔قوت و حرکت سے معمور ہوں یعنی جمود اور تعطل کا شکار ہونے کی بجائے وہ ہر دم رواں دواں ہوں۔فقر وغنا ان کا سرمایہ ہو یعنی اپنے دست و بازو پر انہیں اعتماد ہو اور وہ رزق حلال کمائیں اور سخت کوشی ان کا امتیاز ہو۔یعنی وہ تن آسانی اور آرام پسندی کی بجائے سخت محنت و مشقت کو اپنا وطیرہ بنائیں کہ صرف اِسی طرح زندگی کے اعلیٰ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

(۱۹۷۱ء)

اقبال کا پیامِ خودی

شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے افکارِ عالیہ میں خودی کا نظریہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور علامہ کے تمام افکار اسی محور کے گرد گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔وہ اولین شاعر ہیں جنہوں نے لفظ ''خودی'' کا نیا مفہوم متعین کیا۔اور اس لفظ کو نئے معانی سے آشنا کیا۔اس لئے کہ ان سے پہلے یہ لفظ عام طور پر تکبر اور غرور کے معنوں میں مستعمل تھا۔لیکن اقبال کے یہاں خودی سے مراد احساسِ ذات ،عرفان ذات اور اظہار ذات ہے۔

ان کے نزدیک کائنات کا ہر ذرہ اپنی نمود کے لئے کوشاں ہے اور فرد اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنے آپ کو کمال کی انتہائی بلندیوں پر فائز کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ گویا ہر ذرہ نشہ خودی میں سرشار ہے۔

خودی ایک ایسا جوہر ہے جو زندگی کی بقا اور استحکام کے لئے ضروری ہے۔اس جوہر سے جو بھی عاری ہوگا۔فنا اس کا مقدر ہوگی ۔یہی خودی ہے جو حرکت و عمل کی علامت ہے۔زندگی کا راز ہے اور کائنات کی بیداری ہے۔زندگی کی اصل حقیقت کا عرفان خودی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لئے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا۔اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال فرد کو اپنے آپ میں گم ہو کر زندگی کی حقیقت جاننے کی

تلقین کرتے ہیں۔

اقبال ہراس عمل کے خلاف ہیں جس میں خودی کی موت ہو۔ یہاں تک کہ وہ ایسی بادشاہی کے بھی حق میں نہیں۔ جو خودی سے محروم ہو۔ وہ اس امیری سے جس میں خودی کو بیچا جائے اس فقیری کو افضل اور بہتر سمجھتے ہیں۔ جہاں انسان ضمیر کی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ خودی کا یہ عرفان عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ عشق، عمل کا دوسرا نام ہے۔ جس کے دم سے زندگی میں نغمگی ہے۔ جو نورِ حیات بھی ہے اور نارِ حیات بھی۔ عشق جو ایمان کا جزوِ اعظم ہے۔ جس کے دم سے کفر مسلمانی اور نہ ہونے سے مسلمانی بھی کفر سے کم نہیں۔ کہیں یہ خلیل اللہ کا صدق بن کر ابھرتا ہے۔ کہیں حسینؓ کا صبر بن کر نمایاں ہوتا ہے اور کہیں زندگی کے معرکے میں بدر وحنین کی علامت ہے۔

انسانی خودی اگر علم کے دم سے غیرتِ جبریلؑ ہے تو عشق کے طفیل صورِ اسرافیلؑ کا فریضہ انجام دیتی ہے اور جب یہ عشق غلاموں کو خود شناسی اور خود آگاہی کے آداب سے آشنا کرتا ہے تو ان پر شہنشاہی کے اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ اور غزالیؒ کو عشق ہی کی بدولت آہِ سحر گاہی کی بیش بہا نعمت حاصل ہوتی ہے اور اسی کے طفیل مردِ فقیر کی ذات میں وہ بوئے اسد الٰہی در آتی ہے جو اُسے دارا اور سکندر ایسے پر جلال اور پر شکوہ بادشاہوں سے ارفع و اعلیٰ ایک ایسا مقام بلند عطا کرتی ہے کہ حق گوئی اور بے خوفی اس کی زندگی کا آئین اور دستور بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا سینہ ایمان و یقین کی لازوال روشنی سے منور رہتا ہے اور ایمان و یقین کی یہ لازوال روشنی خودی کے عرفان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

خودی کا عرفان ہی مردِ مومن کو مقام بادشاہی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ صاحبِ خودی کے سامنے ایک دنیا جھک جاتی ہے۔ زمین اور آسمان اس شیر مولا کے شکار ہوتے ہیں۔ صاحبِ خودی بے پناہ قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ ہر شے اس کے اشارے پر سرگرمِ عمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک نگاہ سے تقدیریں بدل دیتا ہے۔ یہ صاحبِ خودی، اقبال کا وہ مردِ مومن ہے جسے وہ عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی

مشکل کشائی کے علاوہ دنیا کی تعمیر و تزئین کا اہم فریضہ بھی اس مردِ مومن کے سپرد ہے۔ مردِ مومن کی خرد کے ساتھ اس کا دل اور اس کی نگاہ بھی مسلمان ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دل و نگاہ کا ایمان لانا خرد کے ایمان لانے سے زیادہ ضروری ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن کی شخصیت ایسی بوقلموں ہوتی ہے کہ ہر لحظہ اس کے کردار اور گفتار میں ایک نئی آن اور ایک نئی شان نظر آتی ہے۔

بندہ مومن کو یہ مقام اس کی خودی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ خودی انسان کا وہ جوہرِ اصلی ہے جس کی بنا پر اُسے کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف عطا ہوا ہے۔ زمین، آسمان، کرسی اور عرش غرض ساری خدائی خودی کی زد میں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان نائب خدا کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور جہاں تقدیر الٰہی بھی رضائے انسان کے تابع ہو جاتی ہے۔

خودی کے ارتقاء کے تین درجے ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی اور زندگی کیا ہے؟ اپنی خودی کا احساس، اپنے ماحول کا علم اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنا اور ماحول کا علم اور معرفتِ الٰہی تبھی حاصل ہو سکتے ہیں جب خودی کا احساس ہو۔ اس لئے احساسِ خودی زندگی کا مقصدِ اولین بن جاتا ہے۔

خودی کے بیش قیمت جوہر کی حفاظت ہی انسان کو گراں بہا بناتی ہے اس لئے کہ جس طرح موتی کی قدر و قیمت اس کی آب و تاب سے ہے اسی طرح انسان کی قدر و منزلت اس کی خودی سے ہے اور یہی عرفانِ خودی اور حفظِ خودی اسلام کی تعلیم ہے۔ اسی لئے اقبال مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ خود کو پہچانو اور اپنے آپ کو اقوام عالم میں سربلند اور فاتح قوم کی حیثیت سے برقرار رکھو۔ اسلئے کہ انسانی زندگی کا مقصد تسخیر کائنات ہے اور تسخیر کائنات کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی خداداد و اعلیٰ صفات، تخلیقی صلاحیتوں اور خفتہ قوئی کو پہچانیں۔ انہیں بیدار کر کے کام میں لائیں اور کارزارِ حیات میں انہیں آزمائیں۔ انہی خفتہ قوتوں کی پہچان ہی خودی ہے اور جو قوم اس جوہر سے صحیح معنوں میں کام لیتی ہیں۔ انہیں عمر جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔

اقبال کا نظریۂ خودی درحقیقت عظمتِ آدمؑ کے عرفان کا دوسرا نام ہے اس لئے کہ انسان ہی

خلاصہ کائنات ہے اور یہ کائنات اس کے لئے پیدا کی گئی ہے اور یہ مقامِ محمود انسان کو اُسی وقت نصیب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قلب کو اس حد تک وسیع کرے کہ یہ کائنات اس کی وسعتوں اور پہنائیوں میں سما جائے۔ اور وہ دنیاوی طور پر اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوتے ہوئے بھی اُن باتوں سے بلند رہے جو اُسے اس کے مقصد تخلیق سے غافل کرتی ہیں۔ خودی کی یہ تربیت اور نشو ونما کا عمل عشق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر خودی آئنہ ہے تو عشق اس کا جوہر اور اگر خودی پھول ہے تو عشق اس کی خوشبو۔ خودی کا راز لا الہ الا اللہ یعنی توحید میں پنہاں ہے۔ اور صاحبِ خودی توحید پرست ہونے کی بنا پر ہی زمانے میں منفرد اور یگانہ نظر آتا ہے۔ کائنات کی رزم گاہِ خیر وشر میں ہر وہ شے جو خودی کو مستحکم کرتی ہے خیر ہے اور جو اسے ضعیف کرتی ہے وہ شر ہے اور خیر وشر کے اس معرکے کو خودی کی تیغ آبداری سے جیتا جا سکتا ہے۔

(۱۹۷۱ء)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے

اقبال اُن چند بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کا تمام کلام ایک پیغام ہے۔ ان کے فکر وفن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ''کیا ہے؟'' کی بجائے ''کیا ہونا چاہئے؟'' کے قائل ہیں۔ گویا وہ حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر تخاطب اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نئی نسل یعنی نوجوانوں سے ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ نوجوان ہی کل کے پاسبان ہیں اور قوم کا مستقبل انہی سے عبارت ہے۔

اقبال ایک انقلابی مفکر تھے اور اسی لئے ان کا نظریہ حیات بھی انقلابی تھا۔ وہ انقلاب کی کشمکش سے معمور زندگی کو قوموں کی بقا کی ضمانت اور انقلاب سے تہی زندگی کو موت کا پیغام سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکش انقلاب

یہ ذوقِ انقلاب کسی وقتی جذباتیت کا نتیجہ نہیں بلکہ ندرتِ فکر وعمل کا ثمر ہے اور اسی کے ذریعے اپنی دنیا آپ تخلیق ہوتی ہے اور یہ ندرتِ فکر وعمل انسان کی فطرت میں ہے۔ کہ اس کی روح میں سکون وجمود کی جگہ ایک تغیر وحرکت موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

دوسرے لفظوں میں اقبال کے نزدیک زندگی کی تعمیر کے لئے قوتِ عمل بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد گویا اقبال زندگی میں کمزوری یا ضعف کی بجائے طاقت اور قوت کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر آرزوؤں اور اُمیدوں کا مرکز بزرگوں کی بجائے نوجوان ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ نوجوانی عمر کا وہ حصہ ہے جس میں انسان بہترین جسمانی اور ذہنی قوتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس کے لہو میں طغیانی اور دل میں جوش و جولانی

ہوتی ہے۔ان کے نزدیک

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

یہی سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنے کی کیفیت ہی ہے جو نوجوانوں میں عقابی روح کو بیدار کرتی ہے۔اور جب یہ عقابی روح بیدار ہوتی ہے تو انہیں اپنی منزلِ مقصود انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبال ایسے ہی صاحب خودی جوانوں سے مخاطب ہیں۔انہیں تعمیر مستقبل کے لئے انہی کے زورِ بازو پر بھروسہ ہے تو کہتے ہیں۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

نوجوانوں سے اقبال کے گہرے تعلق کو ان نظموں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔جو انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں بچوں اور نوعمروں کے لئے لکھیں۔مثلاً پہاڑ اور گلہری ۔مکڑا اور مکھی۔ایک گائے اور بکری۔ہمدردی۔بچے کی دعا۔ماں کا خواب اور پرندے کی فریاد۔ان نظموں میں بھی اقبال نے نئی نسل کو زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تعلیم دی ہے اور یہی وہ اقدارِ حیات ہیں جو نوجوانوں میں آگے چل کر عزم و ہمت کا سبب بنتی ہیں۔یہ عزم و ہمت ان کی شاعری میں کہیں خودی

کی صورت میں جلوہ گر ہے کہیں سوزِ جگر اور عشق و نظر کے نام سے موسوم ہے اور کہیں اسے سرمایہ حیات کہا گیا ہے۔چنانچہ عصر حاضر کے نوجوانوں کو پیغام دیتے ہوئے وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

ایک اور مقام پر تڑاڈنوے یوں مخاطب ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کے نزدیک اس کے مخاطب یہی نوجوان ہیں جنہیں وہ ستاروں سے آگے جہانوں کی تسخیر کے اہل سمجھتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یا ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

انہی جوانوں کو وہ شاہین کے نام سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور انہی جوانوں کے لئے وہ آہِ سحر اور نورِ بصیرت کی یوں دعا کرتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

(۱۹۷۲ء)

اقبال خطوط کے آئینے میں

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان اپنی ذات کے بارے میں جن باتوں کا عام لوگوں کے سامنے اظہار کرنے سے ہچکچاتا ہے، انہیں اپنے مخصوص احباب کے سامنے بے جھجک بیان کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین اور سوانح نگاروں کی اکثریت مشاہیر کے نجی خطوط کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اس لئے کہ اس طرح انہیں متعلقہ شخص کے بارے میں کچھ ایسی داخلی شہادتیں مل جاتی ہیں جو دوسرے ماخذوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں حقیقت یہ ہے کہ جب سے تحریر وجود میں آئی ہے مکتوب نویسی بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کہا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں خط بالمشافہ ملاقات کا قائمقام ہوتا ہے لیکن بعض اوقات خط کی حیثیت نصف ملاقات سے بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ لکھنے والا خط میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھ جاتا ہے جنہیں بالمشافہ ملاقات میں وہ بیان نہیں کر سکتا۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق

''خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ بعض اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔''

گویا خط ذات کا عکس ہوتا ہے اسے شخصیت کا بے تکلف اظہار بھی کہا جا سکتا ہے چنانچہ خطوط کسی شخصیت کی سوانح نگاری کے بہترین ماخذ کا کام دیتے ہیں کیونکہ ان کی حیثیت آپ بیتی کی سی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال خطوط کی اس ادبی اہمیت کا اظہار فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے

کے شعراء کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے"۔

علامہ اقبال کے اس ارشاد کی صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات خطوط میں مکتوب نگار کی ذات اور شخصیت کے وہ چھپے گوشے بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مکتوب نگار کے ذاتی خیالات وعقائد کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ یہ بات علمی اور ادبی مشاہیر کے خطوط کے بارے میں زیادہ صادق آتی ہے۔اس لئے کہ لکھنے والا خطوں میں اپنے مخصوص انداز میں ذاتی میلانات ورجحانات پسند و ناپسند، عادات واخلاق اور احساسات وجذبات کا اظہار کر جاتا ہے یوں خطوط صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

جہاں تک اردو میں مکتوب نگاری کا تعلق ہے اس سلسلے میں اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر بندھتا ہے۔مرزا کے خطوط نے قدیم مشکل اور پر تکلف اسلوب کی جگہ آسان، سادہ اور عام فہم انداز اختیار کیا۔ان کے بعد سرسید، حالی، عبدالحق اور نیاز فتحپوری کے خطوط کی اپنی علمی اور ادبی حیثیت ہے۔سرسید کے خطوط میں ان کی نثر کا رنگ نمایاں ہے۔حالی کے خطوط میں ان کی شخصیت کی سادگی اور بے تکلفی کی عکاسی ہے۔مولوی عبدالحق کے ہاں زبان کا لطف اور شگفتگی ہے۔مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"غبار خاطر" میں انشا پردازی اور تخیل کی بلند پروازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔مہدی افادی اور نیاز کے خطوط میں بھی علمی انداز عام ہے ان کے علاوہ علمی اور ادبی اعتبار سے علامہ اقبال کے خطوط کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ان کے خطوط متعدد مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ جتنے بڑے شاعر اور مفکر ہیں اتنے ہی بڑے انشا پرداز بھی ہیں۔چنانچہ علامہ کی یہ خط وکتابت ان کے سیرت نگاروں اور فن شناسوں کے لیے ایک مستقل موضوع کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔علامہ کو خط لکھنے والے بے شمار لوگ تھے۔دنیا کے ہر حصے سے ان کے پاس خط آتے، اور وہ بڑی پابندی کے ساتھ ہر خط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھتے، علامہ کے مکتوب الیہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے۔تاہم ان میں سے چند مشاہیر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس لئے کہ علامہ کی علمی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بالواسطہ طور پر ہی سہی ان کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح خود علامہ کے افکار وخیالات کا ان لوگوں پر اثر فطری امر ہے۔ان مشاہیر میں جہاں مولانا احسن مارہروی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسے علمائے ادب شامل ہیں۔وہاں قائداعظم محمد علی جناح، عبدالرب نشتر، سرسید راس مسعود، سید غلام بھیک نیرنگ اور خواجہ غلام السیدین جیسے سیاسی زعما کے نام بھی ملتے ہیں۔ان کے علاوہ مولانا غلام قادر گرامی، اکبرالہ آبادی، خواجہ حسن نظامی بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر آل احمد سرور، اختر شیرانی اسد ملتانی، عباس علی خاں، محمد اکرام، مولانا اکبر شاہ خاں، نجیب آبادی، سید نذیر نیازی اور مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی جیسے ادباء اور شعراء کے ساتھ ساتھ ان کے خاص احباب مہاراجہ کشن پرشاد کول اور عطیہ بیگم فیضی کے نام بھی اس فہرست میں شریک ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کا حلقہ بہت وسیع تھا، اور مختلف شعبہ حیات کے لوگوں سے ان کی خط وکتابت تھی لیکن ایک بات ہر جگہ نمایاں ہے کہ وہ ہر مکتوب الیہ کی ذہنی سطح کے مطابق خط لکھتے تھے اقبال عام طور پر خطوط عجلت میں لکھتے تھے کیونکہ ان کی اشاعت مقصود نہیں تھی۔خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"عدیم الفرصتی تحریر میں ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جسے پرائیویٹ خطوط میں تو معاف کر سکتے ہیں مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے"

پھر فرماتے ہیں "میں پرائیویٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہوں' لیکن اس لاپروائی کے باوجود علامہ اقبال کے خطوط کی الگ ادبی شان ہے اور وہ زبان وبیان اور مواد کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ان خطوط کو فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو ایجاز واختصار ان کی بنیادی خصوصیت ٹھہرتی ہے تقریباً ہر خط کا مضمون مختصر ملتا ہے۔گویا وہ صرف کام کی باتیں کرتے ہیں اس کے علاوہ اقبال کے خطوط میں عام طور پر زبان کی سادگی پائی جاتی ہے۔انہوں نے کہیں بھی انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی۔البتہ جہاں کہیں موضوع کی دلکشی نے موقع فراہم کیا ہے وہاں انہوں نے زبان کی رنگینی اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے ہیں۔مثلاً مولانا گرامی کو ۱۹۱۸ء

میں ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن؟ اس سوال کے جواب میں حسب الحکم مراقبہ کیا گیا جو انکشاف ہوا عرض کیا جاتا ہے گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں، کہ خاک اسے جذب کر سکے، یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان میں زمین میں یہ سما نہیں سکتی، کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔"

پھر فرماتے ہیں

"پانی آگ جذب کر لیتا ہے عدم بود کو کھا جاتا ہے پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب کرے؟ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی۔ کہ اس کی قوت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے"

علامہ کے نجی خطوط میں باتیں کم اور علمی مسائل و مباحث زیادہ ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے خطوط میں ادبی سے زیادہ علمی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ لیکن زبان کی سادگی اور ایجاز و اختصار کی بنا پر کہیں خشکی کا احساس نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہی ان خطوط کی خوبی ہے اقبال کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان خطوط کی مدد سے جہاں ہم اقبال کی سیرت کا ایک جامع مرقع ترتیب دے سکتے ہیں۔ وہاں ان میں فکر اقبال کی تشریح اور فلسفۂ اقبال کی تفسیر بھی ہمیں ملتی ہے۔

ان خطوط کے آئینے میں ہر قاری کو تین عکس صاف دکھائی دیتے ہیں ایک اقبال کی ذات کا عکس، دوسرے اقبال کے فکر وفن کا عکس اور تیسرے اقبال کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا عکس جہاں تک اقبال کی ذات کا تعلق ہے ان کے نجی خطوط کے مطالعے سے ان کے دلی خلوص، ان کی علم پروری اور اسلام دوستی اہل وعیال سے ان کی محبت دوستوں کے لئے ان کے ایثار اور عالم انسانیت کے لئے خیرسگالی کے جذبات نمایاں ہیں۔ ہر بڑے ادیب کی تحریروں میں ان کے زمانے کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کی ترجمانی ملتی ہے اور خاص طور پر خطوط میں تو یہ عکاسی

زیادہ نمایاں ہے اقبال کے خطوط میں بھی یہ عکس خاصہ واضح ہے۔ اقبال کا سیاسی اور سماجی شعور اپنے اکثر ہم عصروں سے زیادہ بیدار تھا۔ وہ ایک شاعر اور مفکر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی سیاست سے متعلق تھے اور یہ اس وابستگی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مملکت خداداد پاکستان کا خواب دیکھا اور ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اس مملکت کا خاکہ بھی پیش کر دیا۔ اس کے علاوہ ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے سلسلے میں ان کے دلوں میں جو تڑپ تھی اس کا اظہار بھی انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے خود ان کی شاعری کا بیشتر حصہ عالم اسلام کے لئے بیداری کا پیغام ہے۔ چنانچہ ان کے خطوط میں بھی اس کا اظہار ملتا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں برصغیر پاک وہند کے جو سیاسی سماجی اور معاشی حالات تھے ان پر اقبال کی گہری نظر تھی۔ مختلف سیاسی اور سماجی زعماء سے ان کی مسلسل خط وکتابت اس کا بین ثبوت ہے اس سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناح، سردار عبدالرب نشتر، اکبرالہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ان کے خطوط مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ایک شاعر کے خیالات وافکار صرف اس کی علمی وادبی نگارشات ہی تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اس کی نجی تحریروں خاص طور پر خطوط میں بھی ان خیالات وافکار کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ علامہ اقبال کا فکر وفن، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے اور پیغام کی صحیح تفہیم کے لئے ہمیں ان کے خطوط سے بھی رجوع کرنا پڑے گا کہ ان خطوط میں مختلف مشاہیر کے ساتھ ان کے ادبی مسائل اور علمی مباحث کے ذریعے جہاں اقبال کا نظریہ فن واضح ہو جاتا ہے وہاں ان کے افکار و خیالات کی تشریح وتفسیر کا مرحلہ بھی آسان دکھائی دیتا ہے۔

(۱۹۷۲ء)

اقبال۔ایک ملی شاعر

یوں تو ملت اسلامیہ کسی بھی دور میں اہلِ فکرونظر سے خالی نہیں رہی ۔اور ہر عہد میں یہ متاعِ گراں بہا اسے حاصل رہی ہے۔لیکن بہت کم شخصیات ایسی ہیں ۔جو صحیح معنوں میں ملت بیضا کے درد سے معمور ہوں اور اس کے لئے پیغامِ حکمت وبصیرت بھی رہی ہوں،حکیم الامت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال بھی ایسے ہی صاحب بصیرت دانشور ہیں وہ حقیقی معنوں میں ہمارے ملی شاعر ہیں۔اگر چہ ان سے پہلے بھی ہمیں حالی اور اکبر کے یہاں ملی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن اقبال کی ملی شاعری ان بزرگوں کی شاعری سے کہیں زیادہ فکرونظر کی وسعت اور شعور کی گہرائی کے اعتبار سے ان سے بہت آگے ہے شروع شروع میں ان کی شاعری کی روح ملی نہ تھی۔انہوں نے اساتذہ غزل اور خاص طور پر داغ کے تتبع میں غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔پھر نظم کی طرف آئے۔تو وطنیت کے مروجہ جذبے سے متاثر تھے۔چنانچہ اسی جذبے کے تحت انہوں نے یہ تک کہہ دیا تھا

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

مگر جب اپنے قیام انگلستان کے دوران میں انہوں نے اہل یورپ کی وطنیت پرستی اور مادیت پسندی کا بغور مشاہدہ کیا۔تو وطن پرستی کے بارے میں ان کے خیالات بدلنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مغربی ممالک وطنیت اور قومیت کے نام پر ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں مصروف ہیں۔تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطن کے نام پر قومیت انسانیت کے لئے مہلک ہے، اب انہوں نے قومیت کے تصور کو وطن کے تصور سے الگ کر کے دیکھا۔چنانچہ ان کے نزدیک

مسلمانوں کی قومیت جسے وہ ملت کا نام دیتے ہیں ۔کسی خاص جغرافیائی خطہ زمین یعنی وطن سے نہیں بلکہ ان کے مذہب یعنی اسلام سے ہے۔اور زوال پذیر مسلمانوں فقط اسلامی تعلیمات پر عمل ہو کر ہی دین ودنیا میں عظمت ورفعت حاصل کر سکتے ہیں۔یورپ سے واپسی پر ۱۹۰۸ء سے لے کر آخر دم تک یعنی ۱۹۳۸ء تک اقبال مسلمانوں میں انہی اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں پوری طرح مصروف رہے۔یورپ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمار
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

لیکن یورپ سے واپسی پر ان کا دل اسلام اور ملت اسلامیہ کے درد سے معمور تھا۔اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کو سب سے پہلے پیغام یہ دیا۔کہ وہ کسی مخصوص خطہ زمین کے مالک نہیں۔بلکہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ہر ملک ان کا ملک ہے۔ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔چنانچہ اب انہوں نے فرمایا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمار

اقبال نے مسلمانوں کو تاکید کی۔کہ وہ زمانے کی رو میں بہہ کر وطن پرستی کو نہ اپنائیں۔ وطن کی محبت ہر انسان میں ہوتی ہے۔اور یہ ایک فطری جذبہ ہے۔لیکن وطن پرستی انسانیت کیلئے ہلاکت کا باعث ہے۔مسلمانوں کا تعلق کسی خاص خطہ زمین سے نہیں۔بلکہ وہ ساری دنیا کے باشندے ہیں۔انہیں وطنیت کے زہریلے افکار سے اپنا دامن بچانا چاہیے۔وطن پرستی سب سے پہلے مذہب کو ختم کرتی ہے۔اور مسلمان اپنے مذہب کے بغیر کچھ بھی نہیں۔وطنیت ایک محدود شے ہے اور مذہب لامحدود۔چنانچہ محدود کے لئے لامحدود کو چھوڑنا غلط ہے۔فرماتے ہیں

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انہوں نے مسلمانوں کو دوبارہ ابھرنے اور صاحب اقتدار ہونے کی تلقین کی ہے ۔مگر دنیا میں مقام بلند حاصل کرنے کے لئے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں ۔اقبال کے نزدیک یہ اصول و ضوابط صرف اور صرف اسلامی تعلیمات کو اپنانے سے ہاتھ آسکتے ہیں ۔اور ان کی عملی صورت ہمیں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے اعمال میں نظر آتی ہے ۔چنانچہ اقبال فرماتے ہیں

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یعنی اگر تو ایک مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ۔تو یہ صرف قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے ہی ہو سکتی ہے ۔

اپنی شاعری کے پہلے دور یعنی ۱۹۰۵ تک اقبال تصوف سے متاثر ہیں ۔مگر بعد میں وہ روایتی تصوف کے اس لئے مخالف ہو گئے تھے ۔کہ ان کے نزدیک سوائے مولانا روم ۔سنائی اور عطار کے اکثر صوفیا نے عملی زندگی سے فرار سکھایا ۔اور اس طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ۔تصوف شروع میں انفرادی طور پر لوگوں کے تصفیہ باطن اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ تھا ۔اور اس پر عمل کرنے والے اکثر لوگ اسلام کی روح کو سمجھتے تھے ۔اسطرح وہ تقلید کی رسم قبیح سے محفوظ رہے ۔لیکن بعد میں تصوف خود ایک قسم کی تقلیدی شے ہو گیا ۔اور اس کی وجہ سے مسلمانوں پر ایک طویل اور گہرا جمود طاری ہو گیا ۔چنانچہ اقبال نے مسلمانوں کو تصوف کے اس تقلیدی پہلو سے دور رہنے کیلئے کہا ہے ۔

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ھائے کرامات رہ گئے باقی

اقبال اس بات کا اکثر اظہار کرتے ہیں کہ زندگی ' حرکت اور حرارت دراصل ایک شے کے نام ہیں ۔کائنات کی کوئی شے بھی حرکت وعمل سے باہر نہیں جو افراد یا گروہ یا قوم حرکت و عمل کو چھوڑ دیتی ہے ۔وہ اپنے زوال کے سامان خود پیدا کرتی ہے ۔مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب بھی ان کی بے عملی ہے ۔ان کے نزدیک مسلمانوں کو خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی اور عملی دنیا میں

آنا چاہئے ۔زمانے کے تقاضے ہر لحظہ تغیر پذیر ہیں ۔اور انہیں عمل اور صرف عمل ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے ۔جو قومیں ان تقاضوں سے چشم پوشی کرتی ہیں ۔زمانہ انہیں کچلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے ۔

سکوں محال قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان صرف عقائد سے نہیں بلکہ اعمال سے بنتا ہے ۔چنانچہ اقبال اپنے دور میں مسلمان بچوں کو دی جانے والی تعلیم کے بھی اس لئے خلاف تھے ۔کہ وہ بے عملی کی تعلیم تھی ۔انہیں احساس تھا ۔کہ اگر ان بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس نہ کرایا گیا ۔تو آئندہ مسلمان نسل کبھی عزت وسربلندی حاصل نہ کر سکے گی ۔انہیں خداوندان مکتب سے سخت شکایت ہے کہ وہ شاہینوں کو خاکبازی کا درس دے رہے ہیں ۔ان لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد کسب معاش ہے ۔ان میں نہ خود ایمان کی حرارت اور جوش ہے اور نہ آئندہ نسلوں میں یہ حرارت و جوش پیدا کر رہے ہیں ۔لہذا مسلمانوں کو اس فضول اور بے معنی تعلیم کی بجائے صحیح قرآنی تعلیم کو اپنانا چاہئے ۔ورنہ مکتبوں اور خانقاہوں سے نہ کوئی عالم پیدا ہوگا اور نہ درویش اس لئے کہ ان میں نہ حقیقی علم ہے ۔اور نہ حقیقی روحانیت ۔

اقبال کی ملی شاعری کا مرکز ومحور ان کا پیغام خودی ہے ۔ان کے نزدیک مسلمان جب تک اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوں گے ۔وہ مٹی کے ایک ڈھیر کی صورت ہوں گے ۔عرفان خودی کے لئے عشق ضروری شرط ہے ۔اور عشق سے مراد سرور کائنات ' نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مکمل پیروی ہے ۔اس لئے کہ

در دل مسلم مصطفےٰ است
آبروئے ماز نام مصطفےٰ است

ان کے نزدیک جیسے جیسے کسی کی خودی بیدار ہوتی جاتی ہے ۔ویسے ویسے اسکی قوت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔اور آخر ایک وقت وہ آتا ہے جب صاحب خودی کے لئے بڑے سے بڑا

کام بھی ناممکن رہتا۔اپنی خودی کی بیداری سے بندہ مومن خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر بات خود خدا کی بات بن جاتی ہے۔اور خدا کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کا رکشا کا رساز

اقبال نے مسلمانوں کو جہاں انفرادی خودی کا درس دیا۔وہاں اجتماعی خودی کی تعلیم سے بھی روشناس کیا ہے۔ان کے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں صرف وہی قوم سربلند اور آزاد رہ سکتی ہے جس کے افراد قوم کی طرح ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوں۔افراد اور قوم کا رشتہ لازم وملزوم کا سا ہے۔فرماتے ہیں۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اقبال فرماتے ہیں کہ افراد پر لازم ہے کہ ایک خاص حد تک اپنی خودی کو قائم اور محفوظ رکھیں۔اس کے بعد ملت کی فلاح وبہبود پر اپنی انفرادیت کو قربان کر دیں۔یعنی اپنی انفرادی خودی کو قومی خودی میں ضم کر دینا چاہئے۔اور مکمل اتحاد اور یک جہتی سے اجتماعی طور پر مصروف عمل ہونا چاہئے۔یہی بے خودی کا فلسفہ ہے

اقبال تقلید کے بھی سخت مخالف ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو دوسروں کی تقلید کرنے کی بجائے خود غور وفکر سے کام لینا چاہیئے۔قرآن میں ہماری زندگی کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔لہٰذا دوسروں کی تقلید مسلمانوں کو غلط راستے پر لے جائے گی۔یہی وجہ ہے جب سے مسلمانوں نے دوسروں کی تقلید کی روش اختیار کی ہے۔اس وقت سے زوال پذیر ہیں۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اقبال نے تصور پاکستان کو اجاگر کرنے کے علاوہ مسلمانان عالم کے اتحاد کا خواب بھی دیکھا۔اور اس خیال کو مسلمانوں کے سامنے بھی رکھا۔وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو فکری اور عملی طور پر

ایک ہونا چاہیے۔کیونکہ آپس کا انتشار اور اختلاف ہی ان کے زوال کا سبب ہے۔فرماتے ہیں

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اقبال مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔انہوں نے مسلمانوں کو غیر ملکی سرمایہ داری سے دور رہنے کے لئے کہا ہے۔کیونکہ اس سرمایہ داری میں انسان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔اخلاق تباہ ہو جاتا ہے۔لوگ دولت کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس کے مقابلے میں اقبال اسلامی تعلیمات کے مطابق دولت پر مستحق کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دولت پر غریبوں اور حاجتمندوں کے علاوہ خود ریاست کا بھی حق ہوتا ہے۔

اقبال مسلمانوں کی خستہ حالی اور تباہی کے باوجود مایوس نہیں ہیں۔مایوسی ان کے نزدیک کفر ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری شاعری کا لہجہ عام طور پر رجائی ہے۔وہ مستقبل سے مایوس نہیں۔بلکہ انہیں امید ہے کہ انشا اللہ مسلمانان عالم بہت جلد اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں گے۔اور اقوام عالم کی رہبری کے فرائض انجام دیں گے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

نغمۂ توحید کا یہ مغنی صرف برصغیر کے مسلمانوں کے قلب ونظر ہی کو جلا نہیں بخشتا رہا۔بلکہ اس کا پیغام دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ہے۔اس کا دل دردمند پوری ملت اسلامیہ کے لئے دھڑکتا رہا ہے۔اور اس کے افکار کی روشنی شرق سے لے کر مغرب تک توحید پرستوں کے دلوں کو منور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کوالالمپور سے لے کر رباط تک اسلامیان عالم اقبال کو اپنا ملی شاعر مانتے ہیں۔اور اس کے افکار کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے ہیں۔

(۱۹۷۲ء)

اقبالؒ اور وحدت ملی

کائنات میں جب پہلے پہل خالقِ ارض وسما نے انسان کو تخلیق کیا تو اسے اجتماعی زندگی کا شعور بھی بخشا یہ اسی شعور کا تقاضہ تھا۔ کہ خاندان برادری اور قبیلے وجود میں آئے چنانچہ اسی نسلی وحدت نے ایک عرصے تک انسانوں کو آپس میں مربوط کئے رکھا پھر لسانی وحدت کا احساس بیدار ہوا کچھ مدت بعد جغرافیائی وحدت نے اس جمعیت کو اور وسعت عطا کی اور پھر مذہب نے اجتماعیت کے ان سارے محرکات کو عقیدے کے تحت یکجا کر دیا چنانچہ مذہبی برادری تمام چھوٹی چھوٹی برادریوں پر محیط ہوگئی اور بالآخر مذہب اسلام کی شکل میں انسانوں کو بہترین لائحہ عمل میسر آگیا۔ اسلام نے انسانی اجتماعیت کو ایک وسیع تر مفہوم سے آشنا کیا اور یوں ملت اسلامیہ قوم، ملک، زبان اور رنگ و نسل کے تمام بتوں کو توڑ کر وحدت ملی کے عظیم مرکز پر مجتمع ہوگئی حتیٰ کہ پوری ملت ایسا جسد واحد بن گئی جس کے کسی عضو میں ذرا سی تکلیف سے پورے جسم میں تکلیف محسوس کی جانے لگی مگر افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان معاشرہ وحدت ملی کے اس تصور سے دور ہوتا گیا اور آج یہ حالت ہے کہ ہم اتحاد و یگانگت کی دولت سے بے بہرہ ہیں اور ہمارے باہمی اختلافات نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا لیکن اس تمام تر زبوں حالی کے باوجود بھی دیکھا جائے تو مجموعی طور پر ہم ایک قوم اور ایک ملت کے حصار میں محصور ہیں۔ شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ اسی وحدت ملی کے داعی اور مبلغ تھے اور مفتی محمد عبدہ اور علامہ جمال الدین افغانی ؒ کے بعد وہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ ان کے افکار عالیہ کے

مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے کلام کا غالب حصہ وحدت ملی کے نظریے کی ترویج و اشاعت پر مشتمل ہے ملت کے بارے میں ان کا نظریہ وہی ہے جو اسلام کا ہے چنانچہ جہاں وہ تحفظ خودی پر زور دیتے ہیں وہاں بے خودی کا نظریہ بھی ان کے ہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے بے خودی سے ان کی مراد مدہوشی یا مستی نہیں بلکہ انہوں نے خودی کی طرح اس لفظ کو بھی ایک نیا مفہوم بخشا ہے چنانچہ جہاں وہ فرد کی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی ذاتی خودی کے تحفظ کو بنیاد قرار دیتے ہیں وہاں قومی زندگی کے تحفظ کے لئے ذاتی خودی کو قربان کر دینے کی تلقین کرتے ہیں یہی وہ مقام ہے جہاں ہر فرد ملت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور یہی وہ جذب باہمی ہے جو کائنات کی نظم و ضبط کی دلیل ہے۔

اقبال وحدت ملی کے لئے وحدت فکر و عمل کو اساس قرار دیتے ہیں

چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

جب تک افراد فکری و عملی طور پر ملت سے ہم آہنگ نہ ہوں وہ انتشار و افتراق کا شکار رہیں گے اور اسی صورت میں نہ تو وہ ترقی کی منزلیں طے کر سکیں گے اور نہ اپنی بقا اور سلامتی کا تحفظ کر سکتے ہیں چہ جائیکہ دوسری اقوام پر غالب رہیں ایک منتشر اور غیر متحد قوم خدانخواستہ غلامی کی عبرتناک زندگی سے بھی دو چار ہو سکتی ہے۔ جہاں اس سے اس کے ذوق عمل اور تخلیقی صلاحیتیں ہی نہیں اس کی آبرو اور وقار کا احساس بھی چھن جاتا ہے۔ اقبال فرد کو ملت کے ساتھ منسلک دیکھنا چاہتے ہیں ان کے خیال میں فرد کی نشو و نما ملت کے ربط کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ انسان دوسروں کے ساتھ رہ کر اپنی تمام تر تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اجتماعی ماحول کے بغیر اس کی ذات کے جوہر اصلی یعنی خودی کا ظہور ممکن نہیں جو اس کی بقا و ارتقا کے لئے ناگزیر ہے چنانچہ فرماتے ہیں

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

دریا موجوں کے مجموعے کا نام ہے اسی طرح ملت بھی افراد کے مجموعے کا نام ہے ہر فرد کا اپنا ایک وجود ہے لیکن اس کا یہ وجود ملت کے ساتھ ربط وضبط رکھنے ہی سے قائم ہے ورنہ وہ بے حیثیت ہے۔جس طرح موج جب تک دریا میں ہے،موج کی حیثیت سے زندہ رہتی ہے لیکن دریا سے باہر اس کا کوئی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح فرد جب تک ملت کے ساتھ منسلک ہے فرد ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ اقوام کی تقدیر بھی افراد کے سعی وعمل ہی کی مرہون منت ہے ۔افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ۔ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا۔

فرد کی حیثیت ملت کی وجہ سے ہے اور ملت کی حیثیت افراد کی وجہ سے کیونکہ وہ افراد ہی کے مجموعے کا دوسرا نام ہے ۔دوسرے لفظوں میں فرد اور ملت لازم وملزوم ہیں ۔ایک کا دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا اسی لئے اقبال ملت بیضا کے افراد کو اپنی ملت کے ساتھ ایک مستحکم رابطہ قائم رکھنے کا درس دیتے ہیں کہ اسی رابطے سے مسلمان عظیم عالمگیر قوت بن کر ابھر سکتے ہیں ۔فرماتے ہیں

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

گویا شجر ملت سے پیوستہ رہ کر ہی بہار اسلام کی امید رکھی جا سکتی ہے اس لئے ان کے خیال میں ملت بیضا کے افراد یعنی مسلمانان عالم اگر ذاتی اور اجتماعی طور پر دنیا کی نظروں میں معزز و محترم ہونا چاہتے ہیں تو انہیں ملت اسلامیہ کے مرکز کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا ورنہ مرکز سے جدا ہو کر ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ سکتی۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

پھول کی خوشبو اس وقت تک اپنی اصلیت پہ قائم رہتی ہے جب تک وہ پھول میں رہے اس سے جدا ہو کر پریشانی اس کا مقدر بن جاتی ہے

اپنی اصلیت پر قائم تھا تو جمعیت بھی تھی چھوڑ کر گل کو پریشاں کارواں بو ہوا

اتحاد بذاتِ خود ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے اور معاشرے میں اس کی اہمیت مسلم ہے یوں تو بنی نوع انسان کے فروغ و کمال کے لئے ہر دور میں اس کی ضرورت رہی ہے لیکن دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمانان عالم کا اتحاد زیادہ قوی مؤثر اور ممکن العمل ہے کیونکہ وہ توحید پرست ہیں فکری اور عملی لحاظ سے ایک ہیں ایک خدا ایک رسول اور ایک کتاب پر متفق ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ وحدت کی شکل اختیار نہ کریں ۔اقبال فرماتے ہیں ۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ،ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
ہے فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مسلمانوں کا ایک ہونا ان کی دینی اور دنیاوی سربلندی اور کامیابی کی ضمانت ہے قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور ٹکڑے مت ہو ۔تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا ۔یکجہتی کی ہمہ گیر اقدار پر عمل پیرا رہے کامیابی وکامرانی ان کا مقدر رہی ۔دنیوی جاہ وجلال اور شان وشوکت نے ان کے قدم چومے لیکن جونہی ان میں فرقہ بندی رواج پانے لگی وہ قعر ذلت میں گرنے لگے گویا اتحاد واتفاق ہمارے ملی عروج وترقی کا سبب اور انتشار وافتراق ہمارے زوال وپستی کا باعث ہیں چنانچہ احیائے ملت کے لئے وحدت قائم کرنے کی ضرورت واضح ہے ۔یہ وحدت جغرافیائی حدود کی پابندی نہیں اور کرہ ارض پر یورپ امریکہ افریقہ یا ایشیا ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا احاطہ کر سکتی ہے اسلام نے رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹا کر وحدت ملی کا نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے تمام ملت

اسلامیہ باہم یک ذات یک جہت اور یک جان ہے اور یہ وہ اخوت ہے جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اقبال اسی اخوت ومحبت کے پیامی ہیں جو وحدت ملی کے لئے ناگزیر ہے چنانچہ مختلف مقامات پر فرماتے ہیں۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے فشاں ہو جا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اقبال کے نزدیک مشرق سے لے کر مغرب تک تمام مسلمانوں کی نجات اور سربلندی کا

یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ دینِ حق کی پاسبانی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے اتحاد اور اخوت کو اپنائیں۔ اسی میں ان کی فلاح ہے مشرق اور مغرب کے مسلمان جب تک ایک دوسرے کو اپنا بھائی نہیں سمجھیں گے نہ وہ مشرق میں سرخرو رہ سکتے ہیں اور نہ مغرب میں سرفراز ان کی عزت اور وقار اسی میں ہے۔ کہ وہ رنگ ونسل کے امتیازات کوبل کر ختم کر کے ملت اسلامیہ کے ایک مرکز پر جمع ہوں اس طرح اجتماعی طور پر وہ ایک ناقابل تسخیر قوت بن جائیں گے۔

اقبال اسلامیان عالم کی نشاۃ الثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے چنانچہ ان کی دلی تمنا تھی کہ مسلمان سیاسی طور پر ایک مرکز پر مجتمع ہو جائیں۔ ان کا یہ خواب ان کی زندگی میں تو پورا نہ ہو سکا البتہ ان کے وصال کے ایک عرصے بعد اب اس کی عملی تعبیر کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ باہمی اتحاد و اخوت کی منزل کی طرف عظیم الشان اسلامی سربراہی کانفرنسیں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں۔

(۱۹۷۴ء)

اقبال اور عشق رسولؐ

حکیم الامت، شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کے افکار عالیہ میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ان کے نزدیک عشق راز حیات ہے سرمایہ زندگی ہے اس کے دم سے زندگی میں نغمگی ہے کہ یہ نور حیات بھی ہے اور نار حیات بھی۔

عشق کی راہ مصائب و مشکلات سے معمور ہے مگر عاشق ان مصائب و مشکلات کو راحت خیال کرتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل تگ و دو جاری رکھتا ہے

جس کو عشق کی دولت نصیب ہو گئی اس نے سب کچھ پا لیا عشق کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر دین بھی مکمل نہیں کہ عشق سر دین ہے اور اس راہ کا سالک اسی زینے سے بارگاہ خداوندی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے

علامہ کے افکار میں عشق کہیں عمل کا دوسرا نام ہے اور کہیں ایمان کا جس کے دم سے کفر مسلمانی اور نہ ہونے سے مسلمانی بھی کفر سے کم نہیں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

کہیں یہ خلیل اللہ کا صدق بن کر ابھرتا ہے کہیں حسینؓ کے صبر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور کہیں زندگی کے معرکے میں بدر و حنین کی صورت میں جلوہ افروز ہے۔

اور یہی عشق کہیں دم جبرئیل ہے کہیں دل مصطفیٰؐ کہیں خدا کا رسول ہے اور کہیں خدا کا

کلام ہے۔

جسم و روح ظاہر و باطن سب پر عشق کی حکومت ہے اس میں بے پناہ قوتیں پوشیدہ ہیں عمل عشق کے دم سے ہی جلا پاتا ہے کہ عشق اصل حیات ہے اور زمانے کی تیز و تند رو کا مقابلہ بیل عشق ہی کر سکتا ہے۔

جب یہ عشق خود شناسی اور خود آگہی کے آداب سے واقف کرتا ہے تو صدیوں کے غلاموں پر شہنشاہی کے اسرار کھلنے لگتے ہیں عطار رومی۔ رازی اور غزالی کو عشق ہی کی بدولت آہ سحر گاہی کی نعمت ملتی ہے اسی کے طفیل مرد فقیر کو وہ بوئے اسد اللہی حاصل ہوتی ہے جو اسے دارا و سکندر ایسے پرجلال بادشاہوں سے بھی بلند مقام عطا کرتی ہے کہ حق گوئی و بے باکی اس مرد حق کی فطرت بن جاتی ہے۔

علامہ نے عشق کو مقاصد کی لگن کے معنوں میں استعمال کیا ہے جس کے بغیر انسان کا معنوی ارتقا نامکمل رہتا ہے۔

خودی کو محکم و مستحکم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے کہ یہ شدت احساس کی وہ حالت ہے جو حیرت ناک حد تک انسانی شخصیت کو لازوال بنا دیتی ہے۔ اور اس طرح تسخیر فطرت کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی خلقت کا ایک بڑا مقصد ہے۔ یہ تسخیر عقل کی طرح کسی مفاد یا منفعت کی تابع نہیں بلکہ انسان کو عالم کون و مکاں کی آقائی اور دنیوی ماحصل سے بے نیازی کی دولت عطا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں

فطرت کو خرد کے رو برو کر
تسخیر مقام رنگ و بو کر

اور یہی وہ مقام ہے جہاں مرد مومن کو نائب خدا کا درجہ ملتا ہے اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور غالب و کار آفریں ہوتے ہوئے وہ زمانے کی مشکل کشائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

بندہ مومن خاکی ہوتے ہوئے بھی نوری صفات رکھتا ہے کہ اس میں اس کے آقا کی

صفات کا عکس ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا دل دونوں جہاں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

وہ دلفریب اداؤں اور دل نواز نگاہوں کا مالک ہے وہ دنیا سے کم امیدیں لگاتا ہے اور زیادہ تر اپنے عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

وہ گفتگو کے وقت نرم ہے لیکن میدان عمل میں انتہائی گرم رزم ہو یا بزم وہ ہمیشہ پاک دل و پاکباز رہتا ہے یہ نرمی اور سختی بندۂ مومن کی شخصیت کا جوہر ہے۔

اسی بندۂ مومن کا ایمان حق کا مرکز قرار پاتا ہے اور اس کے سامنے یہ دنیا ایک خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

اسی کو اقبال عقل کی منزل اور عشق کا حاصل قرار دیتے اور اسے حلقہ آفاق میں گرمی محفل کا سبب سمجھتے ہیں۔

مومن کا مقام اتنا ارفع واعلیٰ ہے کہ جبریل وسرافیل جیسے جلیل القدر تک بھی اس کے زیر دام ہوتے ہیں

اس مرد مومن کی شخصیت ایسی بوقلموں ہے کہ ہر پل ہر ساعت اور ہر گھڑی گفتار ہو یا کردار اس میں ایک نئی آن ایک نئی شان دکھائی دیتی ہے۔

بندۂ مومن کو یہ مقام عشق کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔اور یہ عشق توحید ورسالت پر کامل ایمان کا دوسرا نام ہے۔

دین عشق کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور نہ دنیا کی مشکلات اس کے بغیر حل ہو سکتی ہیں چنانچہ یہی وہ عشق تھا جس نے ضعیفوں کو قوی اور فقیروں کو بادشاہ بنا دیا تھا

کلام اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے اقبال نے لفظ عشق کو زیادہ تر عشق رسول صلی علیہ وآلہ وسلم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور جہاں کہیں بندہ مومن یا مرد مومن کا لفظ استعما کیا ہے وہ مثالی انسان یا فوق البشر کے معنوں میں ہے جس سے ان کے نزدیک مراد ہے سرور کائنات، خاتم النبیین سرکار دوعالم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کی ذات بابرکات۔

گویا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے کلام کا مرکز ومحور ہے

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ است
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ان کے نزدیک عشق رسول ہی ایسی کسوٹی ہے جس پر ایمان کو پرکھا جا سکتا ہے

اگر یہ دولت حاصل نہیں تو کتنی ہی عبادت وریاضت کر لی جائے۔بے فائدہ اور بے ثمر ہے۔

علامہ رحمت عالم سے محبت کو قرب الٰہی کا وسیلہ سمجھتے ہیں چنانچہ لوح وقلم تک کو عاشق رسول کی ملکیت قرار دیتے ہیں۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

کلام اقبال کے علاوہ سیرت اقبال کا بھی مطالعہ کیا جائے۔تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عشق رسول اقبال کی پوری زندگی میں جاری وساری تھا۔

علامہ کی طبیعت میں اس قدر سوز وگداز تھا اور وہ عشق رسول میں اس قدر سرشار تھے کہ جب بھی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر پاک ہوتا بے تاب وبے قرار ہو جاتے اور دیر تک ان کی آنکھیں پرنم رہتیں۔

علامہ کے نزدیک عشقِ رسول سِرِ دین بھی ہے اور وسیلۂ دنیا بھی۔اس کے بغیر انسان نہ دین کا ہے نہ دنیا کا۔

دردلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ماز نام مصطفیٰ است

اور یہ عشق رسول کا کرشمہ تھا کہ مغرب کے افکار کی چکاچوند بھی ان کے دل سے خاک مدینہ ونجف کی عظمت ورفعت نہ بھلا سکی۔

معراج کائنات میں ایک عظیم واقعہ ہے جب خاتم النبیین سرکار دوعالم معبود حقیقی کے حکم سے آسمانوں کی سیر کو تشریف لے گئے اور محبوب ومحبّ میں راز ونیاز کی باتیں ہوئیں اقبال اس

واقعے کو انسانی عظمت کی دلیل سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کا کلام اور ان کی زندگی سرورِ کائنات کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں کی روشنی سے منور ہے ان کا دل ایک سچے عاشق رسول کا دل بن کر دھڑکتا ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی ہیں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسین وہی طٰہٰ

مولائے کل رحمت عالم کی خوابگہ مدینہ منورہ ہر عاشق رسول کے لئے قبلہ و کعبہ کا درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ خود رب کعبہ بھی اسی ذات والا صفات کا شیدا و والا ہے۔ جس سے اس مقدس شہر کو نسبت ہے اقبال اس مقام کو ایسی ادب گاہ سمجھتے ہیں۔ جو عرش سے بھی نازک تر ہے اور جہاں حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی جیسے اکابر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اقبال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کائنات کا ایسا محور و مرکز سمجھتے ہیں جس کی تلاش میں زندگی کے قافلے رواں دواں ہیں۔

آیہ کائنات کا معنیِ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اقبال ایسے عاشق رسول تھے جن کی ایک ایک سانس عشق رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ یہ وہ مقام ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ وصال کے وقت بھی حکیم الامت کے لبوں پر حجاز مقدس ہی کا ذکر خیر تھا اور انہوں نے یہ چار مصرے بار بار دہراتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

قرآن مجید میں خود خالق کائنات جس ذات پاک کی تعریف و مدح فرماتا ہو ایک انسان کی کیا مجال کہ اس کی کوئی توصیف کر سکے۔ لیکن پھر بھی حضرت حسان بن ثابت سے لے کر آج کے دور کے شاعر تک ہر سخنور نے اپنی اپنی بساط کے مطابق نعت رسول مقبول کہنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بعض شعرا کو قبولیت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اقبال وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے نعت کے عنوان سے اگرچہ باقاعدہ کوئی نظم نہیں کہی۔ لیکن ان کے پورے کے پورے کلام میں عشق رسول وصف رسول اور سیرت رسول کا واضح عکس ملتا ہے تاہم ان کے اشعار نعت کے زمرے میں شمار ہو سکتے ہیں اور بلا شبہ اپنے انداز بیاں کے سبب کئی روایتی انداز کی نعتوں پر بھاری ہیں مثلاً

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب:

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

(۱۹۷۴ء)

نئے ذائقے

"نئے ذائقے" اردو اکادمی ملتان کے تنقیدی جلسوں میں پڑھے جانے والے مختلف تنقیدی مقالات ومضامین کا انتخاب ہے جس میں ملتان کے تقریباً تمام قابل ذکر مقالہ نگاروں کی نمائندہ تحریریں شامل ہیں اورا سے سید ریاض زیدی اور فیاض تحسین نے مرتب کیا ہے۔

کتاب کے پہلے مقالے "تخلیقی عمل" میں عرش صدیقی نے کچھ بنیادی سوالات اٹھائے ہیں۔ مثلاً تخلیقی عمل کیا ہے؟ اور ذہن انسانی میں افکار وخیالات کہاں سے اور کیونکر آتے ہیں؟ اور کیسے تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں؟ اور کیا تخلیقی عمل اپنے اردگرد سے بے نیاز ہے؟ اور کیا صرف ذہن انسانی کو فن یا تخلیق کا خودمختار منبع ومخرج قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کے نزدیک تخلیقی عمل ایک رد عمل ہے اور اس میں شعور ولاشعور برابر کے حصہ دار ہیں اور سچے اور اچھے فنکار کی تخلیقی قوت اور سچے اور اچھے سائنسدان ریفارمر یا فلسفی کی تخلیقی قوت کی اصل ایک ہے اور ان سب کے ذہنوں میں ہونے والے تخلیقی عمل کے بنیادی اصول ایک ہی ہیں عرش صاحب نے اپنے موقف کی متعدد مثالوں سے وضاحت کی ہے۔ مگر اختلاف کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

سید قدرت نقوی نے "اردو مرثیہ پر ایک نظر" کے تحت نہایت بلیغ پیرائے میں قدیم جدید مرثیے کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ بیان کر دی ہے جو ان کے تبحر علمی اور تعمق فکری کی دلیل ہے۔

اس طرح ابن حنیف نے اپنے مقالے "مصر کی قدیم رومانی شاعری" میں خاصی محنت اور جستجو سے کام لیا ہے ان کا یہ مقالہ ہر لحاظ سے تحقیقی اور معلوماتی ہے اور تحقیقات سے ان کی دلچسپی کی

منہ بولتی تصویر ہے۔ البتہ جگہ جگہ اقتباسات کی بھرمار اور کہیں کہیں تکرار نے اس کے مجموعی تاثر کو قدرے کم کر دیا ہے۔

سلیم اختر نفسیاتی تنقید میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مقالہ "ادب...... نرگسیت کے آئینے میں" انکی وقت نظری اور ژرف نگاہی کی روشن دلیل ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے کامیاب ہے۔

عین الحق فرید کوٹی نے اپنے مضمون میں سنسکرت اور پراکرتوں کے باہمی تعلق کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے اس قدیم لسانی مفروضے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنسکرت ایک نہایت شدھ زبان ہے اور تمام غیر آریائی یعنی مقامی زبانوں سے مبرا ومنزہ ہے۔

فرخ درانی نے ادب میں ابلاغ کا مسئلہ چھیڑ کر اظہار وابلاغ کا فرق نمایاں کیا ہے ان کے نزدیک اظہار فنکار کا اور ابلاغ قاری کا مسئلہ ہے مگر ابلاغ بھی ثانوی لحاظ سے فنکار ہی کا مسئلہ ہے کہ اس کے لیے تسکین وترفیع ذات کا ذریعہ ہے گویا اظہار فن کار کا فرض اور ابلاغ فن کار کی خواہش ہے ابلاغ کے اس مسئلے نے انہیں کچھ الجھا دیا ہے اور یوں اس مقالے میں بھی "ابلاغ" کا مکمل ابلاغ نہیں ہو سکا۔

نذیر احمد نے جنس اور ادب کے تحت ایک فکر انگیز بحث کی ہے ان کے خیال میں جنس اور اس سے پیدا شدہ الجھنیں نہ صرف محرک تخلیق بنتی ہیں۔ بلکہ بیشتر ادبی کش مکشوں کی تہہ میں یہی الجھنیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اے بی اشرف نے اپنے مضمون میں پریم چند کے ناولوں پر اشتراکی انقلاب کا اثر واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شمیم ترمذی نے "غالب ایک نفسیاتی تجزیہ" میں غالب کے فن شخصیت اور اس کے دور کا تجزیہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اسی طرح سلطان صدیقی نے "نظیر کی ترقی پسندی" کے جواز میں اس کی عوامی نظموں سے اقتباسات پیش کر کے نظیر کی پر گوئی ہمہ جہتی اور بوقلمونی کا اظہار کیا ہے۔

یحییٰ امجد نے غزل کا تخلیق سے تحسین تک کا سفر بڑے شاعرانہ اسلوب میں بیان کیا ہے لیکن شعری اقتباسات پیش کرتے وقت انہوں نے کئی مقامات پر معروف ناموں کی بجائے نسبتاً گمنام لوگوں کو نمائندگی دے دی ہے۔

ریاض زیدی نے ''فکرِ اقبال، چند رخ'' کے عنوان سے کلام اقبال میں انسانی فضیلت و عظمت کا سراغ لگایا ہے۔ آخر میں اس مجموعے کے سب سے اہم مضمون پر اظہار خیال کروں گا اور وہ ہے مسعود اشعر کا مضمون 'نئے ذائقوں کے زخم' میرے نزدیک یہ مضمون کتاب میں سب سے زیادہ وقیع اور خیال انگیز ہے اور مقام کے اعتبار سے اُسے مجموعے کی ترتیب میں پہلا درجہ حاصل ہونا چاہیے تھا۔ ویسے اس کتاب کا نام بھی اسی مضمون کے عنوان سے ماخوذ ہے، اشعر صاحب نے اس بسیط مضمون میں نئی شاعری اور نئے افسانے کے حوالے سے جدید طرز احساس کو سمجھنے اور سمجھانے کی پرخلوص کوشش کی ہے۔ نئے ادب میں جو یک منظری اکتاہٹ، انتشار ذات اور عدم تحفظ کا احساس نمایاں ہے۔ اس نے تخلیقی طور پر پیچیدگی، تشکیک اور بے مقصدیت کی شکل اختیار کرلی ہے ان کے نزدیک نیا شاعرانہ اور نیا ادیب بیک وقت اپنی پیچیدہ اور واضح ذات کو پیش کرنے کے لیے نئی زبان اور نئے اسلوب کی تلاش وجستجو میں ہے اور یہ نیا طرز اظہار ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندانہ ادب کے خلاف ایک ذہنی ردعمل ہے۔ اشعر صاحب کا یہ مضمون اپنی زبان اور طرز بیان کے اعتبار سے بھی ایک خوبصورت دلچسپ اور زندہ تحریر ہے۔

مجموعی طور پر ''نئے ذائقے'' اُردو اکادمی ملتان کی ایک معیاری ادبی اور فکری پیش کش ہے اور امید ہے کہ اس کے مندرجات اپنی ثقاہت اور متانت کی بنا پر اُردو کے علمی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

کروٹ کروٹ خوشبو

ماجد صدیقی پنجابی کے معروف شاعر ہیں، مگر اردو کے نوجوان غزل گوشعراء میں بھی ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ یہ مجموعہ جو ان کی صرف اردو غزلوں پر مشتمل ہے، اپنے نام میں بھی ایک خاص انفرادیت اور ایک معنی خیز دلکشی رکھتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے ماجد کی غزل گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے ریاض مجید لکھتے ہیں۔

''ان غزلوں کی ایک نمایاں صفت ماجد کا متوازن طرزِ احساس اور اس کا اظہار ہے۔ اس کے ہاں زندگی کے دکھوں کا اظہار بھی ہے اور زندگی کی سیاہ رات میں کہیں کہیں ملنے والی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی خوشیوں اور لذتوں کا ذکر بھی''

ہمارے خیال میں ماجد کی غزلوں میں غم سے زیادہ خوشی اور افسردگی سے زیادہ شگفتگی کا احساس نمایاں ہے۔ وہ تجربات حیات کے تلخ وترش ذائقوں کی جگہ زیادہ تر شیریں ذائقوں کا شاعر ہے۔ اگرچہ زندگی میں خوشی کا احساس وقتی اور لمحاتی ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں غم والم کی کیفیت دیرپا بلکہ دائمی حیثیت رکھتی ہے لیکن زندگی میں خوشی کا مقام بھی بہرحال اپنی جگہ پر ہے اسی احساس سے رجائیت پسندی جنم لیتی ہے جو زندگی کی تعمیر وتزئین کے لیے بنیادی کام دیتی ہے ماجد کے ہاں رجائیت کا عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ وہ دکھوں میں بھی اپنے لئے راحت کا سامان مہیا کر لیتا ہے۔ غموں کے ہجوم میں بھی خوشی کا پہلو تلاش کرتا ہے یہی اس کی انفرادیت ہے اس کی رجائیت میں حقائق کی نفی اور بیرنگی کی کیفیت نہیں، بلکہ ایک قسم کی تازگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ تازگی مثبت اور صحت مند اقدار حیات کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے یہ شعر دیکھئے۔

جھڑتا ہے کوئی پھول تو رو دیتے ہو ماجدؔ
جینا ہے تو کھلتی ہوئی کلیوں کو بھی دیکھو

نکلا ہے اُدھر چاند، ادھر سوچ میں گم ہو
جیتے ہو تو جیتے ہوئے لمحوں کو بھی دیکھو

ہم ہیں ماجدؔ سلگتے دیئے رات کے
بجھ گئے بھی تو ہو گی سحر سامنے

ہمیں پہ ختم ہے افسردگی بھی پر ماجدؔ
کھلائیں پھول چمن میں جو مسکرائیں کبھی

جھڑتا نہ دیکھ شاخ سے پتوں کو ہی فقط
ماجدؔ شگفتِ موسمِ گل کا سماں بھی دیکھ

اوراس کا یہ مصرع

ع: ماجدؔ یہ زندگی تو عبارت ہمک سے ہے

اس کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا منہ بولتا ثبوت ہے

اکثر نئے شاعروں کے برعکس ماجدؔ کی بیشتر غزلوں کے مطلعے رواں دواں اور بے ساختہ ہیں ۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس نے جدید ہوتے ہوئے بھی روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔یہ مطلع دیکھئے۔

مہک اٹھیں یہ فضائیں جو لب ہلائیں کبھی
ہمیں بھی چھیڑ کے دیکھیں تو یہ ہوائیں کبھی

تنہا نہ رہو شہر میں اوروں کو بھی دیکھو
روتوں سے نکل پاؤ تو ہنستوں کو بھی دیکھو

ماجدؔ کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت ان کی چھوٹی بحریں بھی ہیں۔ ناصر کاظمی اور باقی صدیقی کی طرح ماجد دیقی نے بھی چھوٹی بحروں کو زیادہ استعمال کیا ہے ان بحروں کی افادیت مسلم ہے اور ماجد نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کہیں کہیں ماجد کے شعروں کی زبان کچھ اکھڑی اکھڑی بھی نظر آتی ہے چنانچہ ایسے مواقع پر اس کا اسلوب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ غالباً ایسے اشعار شاعری کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہیں جنہیں اس مجموعے میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح اس کی بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جو صرف تین شعروں پر مشتمل ہیں اور بعض نو دس اشعار سے بھی زیادہ کی ہیں۔ یہ افراط و تفریط کچھ اچھی نہیں لگتی یوں بھی کوئی شعری مجموعہ ترتیب دیتے وقت اگر کڑا انتخاب کر لیا جائے تو اس صورت میں وہ شاعر کے فن کا زیادہ نمائندہ اور بہتر معیار کا حامل ہوگا۔

بہر حال کروٹ کروٹ خوشبو، نئی اردو غزل کے رنگا رنگ گلدستے میں ایک خوشبودار اضافہ ہے۔

ادب اور جدلیاتی عمل

"ادب اور جدلیاتی عمل" پروفیسر سجاد حارث کے سولہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ان مضامین کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں۔ادب اور جدلیاتی عمل، عبداللہ حسین اور اداس نسلیں، ادب میں مسیحائی کا مسئلہ۔مرزا ادیب کے یک بابی ڈرامے۔رقص کے قدیم روپ اور ڈرامہ، ایک روشن ضمیر امریکی شاعر، راشد کے خطبہ صدارت پر ایک تنقیدی نظر، ژاں پال، سارتر، اشتراکی، حقیقت نگاری، اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبرآبادی، منور خاں دلگیر ایک عوامی شاعر، شاعری میں موضوعاتِ مرگ کی نیرنگیاں، ادب میں بورژوا تصورات، یادوں کی برات پر چند تاثرات، جدید اردو شاعری میں بغاوت کی روایت اور شاعر، اجتماعی انسان اور شاعری چنانچہ ان عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مضامین متنوع موضوعات کے حامل ہیں۔سجاد حارث ایک ترقی پسند نقاد ہیں، چنانچہ ان مضامین انہوں نے سائنسی اور تاریخی اندازِ فکر کے ساتھ زندگی اور ادب کا ایک ترقی پسند نظریہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ان مضامین میں ان کا ایک واضح نظریاتی موقف ہے کہ انہیں شخصیات سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی ان شخصیات کی تحریروں اور تخلیقات اور ان کے نظریاتی مواد سے ہے۔چنانچہ ایک روشن ضمیر امریکی شاعر۔ژاں پال، سارتر، اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبرآبادی منور خاں دلگیر ایک عوامی شاعر اس ضمن میں آتے ہیں۔ایک روشن ضمیر امریکی شاعر کے زیرِ عنوان انہوں نے والٹ وٹمین کی شخصیت اور شاعری کا تعارف کرایا ہے۔"ژاں پال سارتر" میں نہوں نے فرانس کے معروف ادیب اور مفکر سارتر کی ذات اور اس کے فلسفہ وجودیت پر کھل کر بات کی ہے۔اسی طرح اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبرآبادی کے عنوان سے انہوں نے نظیر کے عہد کی مخصوص صورت حال میں نظیر کی شاعرانہ شخصیت اور ان کی فنی

عظمت کا جائزہ لیا ہے۔اس طرح منور خاں دلگیر ایک عوامی شاعر" کے تحت انہوں نے غالب مومن اور ذوق کے ہم عصر شاعر منور خاں دلگیر کی دیہاتی زبان کی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس کی دلچسپ زبان کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔مثلاً دلگیر کی ایک مسدس" روپیہ کی تعریف میں سے ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ہی روپیہ باپو پوت — یوہی روپیہ مہا سپوت
یوہی روپیہ اتم ادت — یوہی روپیہ پوت کپوت
باہن کو اے نہ بھیا ہے — سب کا رام روپیا ہے

(یعنی یہی روپیہ باپ اور بیٹا ہے۔یہی روپیہ نیک صالح فرزند ہے، یہی روپیا احمق نہایت احمق ہے، یہی روپیا لائق فرزند ہے نہ کوئی بہن ہے نہ بھائی ہے، سب کا خدا روپیہ ہے)

غالباً دلگیر کو اردو ان طبقے میں متعارف کرانے کے لئے ان کی شاعری پر یہ پہلا تنقیدی مضمون ہے اور اس اولیت کا سہرا بجا طور پر سجاد حارث صاحب کے سر ہے۔

ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے فن اور شخصیات کے موضوع پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن اس کتاب میں ایسے موضوعات پر بھی چند اچھے مضامین ملتے ہیں، مثلاً عبداللہ حسین اور اداس نسلیں "مرزا ادیب کے یک بابی ڈرامے" اور راشد کے خطبہ صدارت پر ایک نظر" یادوں کی بارات پر چند تاثرات اور شاعر، اجتماعی انسان اور شاعری، ہم عصروں کے بارے میں لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن ان مضامین میں سجاد حارث نے اپنے ہم عصروں عبداللہ حسین، مرزا ادیب، راشد جوش اور حمایت علی شاعر کے فن اور شخصیت کو نہایت سلامت روی کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے۔اسی طرح "ادب اور جدلیاتی عمل" ادب میں مسیحائی کا مسئلہ رقص کے قدیم روپ اور ڈرامہ اشتراکی حقیقت نگاری، شاعری میں موضوعاتِ مرگ کی نیرنگیاں۔ ادب میں بورژوا تصورات اور جدید اردو شاعری میں بغاوت کی روایت ترقی پسند رجحانات اور اشتراکی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان تمام مضامین کی زبان فکری متانت اور علمی وقار کی مظہر ہے مختصراً فکر و نظر کے اعتبار سے "ادب اور جدلیاتی عمل" ہمارے تنقیدی ادب میں ایک خوشگوار اور گراں مایہ اضافہ ہے۔

عرفانِ جمیل

''عرفان جمیل'' پروفیسر جمیل مظہری کے مراثی وقصائد کا مجموعہ ہے۔اردو میں انیس ودبیر کی کلاسیکی روایت کے بعد جدید مرثیے نے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔اور آج کے دور میں بھی مرثیہ زندہ اور توانا ہے۔جدید مرثیے کے معماروں میں جہاں آغا سکندر مہدی، ڈاکٹر سید صفدر حسین نسیم امروہی، آلِ رضا، نجم آفندی اور جوش ملیح آبادی قابلِ ذکر ہیں۔وہاں جمیل مظہری کا نام بھی آتا ہے۔''عرفانِ جمیل میں ان کی چند رباعیوں اور سلاموں کے علاوہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۶۲ء تک لکھے ہوئے ان کے چھ مرثیے اور چھ قصیدے شامل ہیں۔یہ مرثیے ''عرفانِ عشق'' 'پیمان وفا' عزمِ محکم' 'مضرابِ شہادت'' افسانۂ ہستی، اور شامِ غریباں، کے عنوانات کے تحت شہادت امام عالی مقامؑ، سفر جناب امامؑ شہدائے کربلا حضرت عونؑ ومحمدؑ اور حضرت زینبؑ کے احوال پر مبنی ہیں اس طرح قصائد میں تین نعتیہ ہیں ایک قصیدہ حضرت علیؑ کی مدح میں ہے۔ایک قصیدے میں مرزا غالب اور ان کے ممدوح حضرت علیؑ دونوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور آخری قصیدہ غالب کے مشہور قصیدے ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' کی مخمس کی صورت میں تضمین ہے۔

جمیل مظہری کے مرثیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب بیان انیس، غالب اور اقبال سے ملتا ہے۔کتاب کے شروع میں بر سبیل تذکرہ کے عنوان سے ڈاکٹر سید صفدر حسین نے مصنف کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جناب جمیل مظہری کو اپنے خاندانی اثرات کے تحت مرثیہ نگاروں کے دونوں معروف دبستانوں سے فیض یاب

ہونے کا موقع ملا تھا۔لیکن ان کے آغازِ شعور ہی سے ان کے خاندان کے اندر اور خاندان کے باہر تمام ملک میں چونکہ میر انیس کا سکہ رواں ہو چکا تھا اس لئے ان کے مذاقِ سلیم کی پرداخت میں انیس کے رنگِ کلام کا بڑا حصہ ہے''

اسلوب بیان کے علاوہ ان کے موضوعات میں بھی قدیم اجزاء کے ساتھ ساتھ ہمیں جدید عہد میں حیات وکائنات کے متنوع مسائل کی گرہ کشائی ملتی ہے۔یوں مظہری صاحب نے ہماری نئی نسل کے لئے مرثیے کے جدید امکانات کی نشاندہی کر کے اس صنف کا فنی وقار بحال کرنے کی کوشش کی ہے ان کے ہاں مرثیت کی مخصوص فضا کے ساتھ ساتھ جدید فکر کی پختگی بھی برقرار رہتی ہے گویا جدید سیاسی، سماجی اور نفسیاتی شعور کے ساتھ ان کے یہ مسدس مرثیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔چنانچہ قدیم وجدید دونوں مکاتب فکر کے لئے یہ قابل توجہ ہیں۔

اردو کی مذہبی قصیدہ نگاری میں منیر شکوہ آبادی امیر مینائی، محسن کاکوروی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی کے نام نمایاں ہیں، جمیل مظہری کے مذہبی قصائد ان اساتذہ فن کے قصائد کے مقابلے میں برتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ان کی یہ مدحیہ نظمیں ان کے عمیق مشاہدے، وسیع تجربے، شگفتہ اسلوب بیان اور فنی پختگی کی بنا پر اہم ادبی کاوشیں ہیں۔آخر میں بطورِ نمونہ ان کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ وارث میراث خلیل
خالق جذبہ قربانی و روحِ تعمیل
اس کی سیرت ہوئی ایک فطرتِ کبری کی دلیل
جس سے دیکھی نہ گئی نوعِ بشر کی تذلیل
جس نے انسان کو پستی سے ابھارا وہ حسینؑ
جس کے تیور تھے مشیت کا اشارا وہ حسینؑ

ایک رباعی ہے

اے خالق ارض زندگی پیدا کر ذرات میں اوجِ سرمدی پیدا کر
مٹی کو پلا چکا ہے خون شبیر اب تو مٹی سے آدمی پیدا کر

اسی طرح سلام کے یہ دو شعر دیکھئے۔

امامت کی جو منزل تھی سمجھ میں آ گئی سب کے
شہادت کا جو مقصد تھا وہ کب دنیا نے پہچانا

حاصلِ طاعت کونین ہے بے شک وہ نماز
جو ادا بھی نہ ہوئی اور قضا بھی نہ ہوئی

....

صورت گر

"صورت گر" مظہر عباس انصاری کے چار ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ہے۔اصنافِ ادب میں ڈرامے کی حیثیت نمایاں ہے اور ڈرامے کا ارتقاء سالہا سال کی کوششوں پر محیط ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے روایتی میلوں ٹھیلوں اور مذہبی تہواروں کے موقع پر کھیلے جانے والے ناٹکوں کا نام آتا ہے۔ان کے بعد تھیٹریکل کمپنیوں میں ڈرامے اسٹیج ہونے لگے اور پھر فلموں کا دور آیا تو فلمی ڈرامے لکھے گئے۔پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رواج سے بھی ڈراموں کی ایک نئی صورت وجود میں آئی ہے۔فلم اور ٹیلی ویژن میں جہاں ڈرامہ بیک وقت آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا جاتا ہے۔وہاں ریڈیو پر ڈرامے کو صرف سنا ہی جا سکتا ہے۔گویا یہ صرف آواز کا کھیل ہے۔بقول بادشاہ حسین

"ریڈیو ڈرامے کی مثال ایسی ہے جیسے گھپ اندھیرے میں کچھ آوازیں آ رہی ہوں۔حالِ دل کہا جا رہا ہے۔جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔احساسات کا اظہار ہو رہا ہے یا زندگی کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں۔سننے والوں کو نہ ان کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں، نہ ان کے افعال نظر آتے ہیں اور نہ ان کی حرکات ظاہر ہوتی ہیں، نہ فاصلوں کا احساس ہے اور نہ اجنبیت کا تاثر، سننے والا گوش بر آواز ہے اور ان کی آوازوں ہی سے واقعات اور حالات کا سیاق وسباق، تعلق وربط، رشتہ وتسلسل سمجھ لیتا ہے، چونکہ وہ صرف حسنِ سماعت ہی سے یہ سب کچھ حاصل کرتا ہے۔اس لئے گہری توجہ اور مکمل دلچسپی لیتا ہے۔

مظہر عباس انصاری ایک عرصے سے ریڈیو سے منسلک ہیں۔اس لئے نثری تمثیل کے تمام اسرار ورموز سے بخوبی واقف ہیں ان کے لکھے ہوئے کئی ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو کر مقبول بھی ہو

چکے ہیں۔ایسے ہی چار ڈرامے پیشِ نظر کتاب میں شامل ہیں۔

پہلی تمثیل "گوشۂ عافیت" ٹالسٹائی کی ایک شہرۂ آفاق اور مقبول کہانی سے ماخوذ ہے۔دوسری تمثیل "سینی ٹوریم" طبعزاد ہے یہ ایک شکستہ دل کی داستان ہے۔تیسری تمثیل "نغمۂ سنگ" کا مرکزی خیال جان اسٹین بک کے ناول "دی پرل" سے ماخوذ ہے۔ناول کے طویل وعریض پلاٹ میں سے تمثیلی عنصر کا انتخاب مصنف کی فنی مہارت اور ذوقِ تلاش کا ثبوت ہے۔چوتھی تمثیل "صورت گر" ہے جس پر اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔اس کھیل کا پلاٹ جان نیرو کے مشہور افسانے "عزرائیل" سے لیا گیا ہے مصنف نے افسانے کو بڑی خوبصورتی سے ڈرامے کا روپ بخشا ہے۔

جن تمثیلوں کے مرکزی خیال مغربی مصنفین کی کہانیوں پر مبنی ہیں۔انہیں مصنف نے مشرقی ماحول اور کرداروں میں ڈھال کر ایسی مانوس فضا پیدا کی ہے جس میں کسی قسم کی اجنبیت نہیں۔کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ڈرامے مغربی کہانیوں سے ماخوذ ہیں اور یہی تمثیل نگاری کی کامیابی کی دلیل ہے "سینی ٹوریم" جو مصنف کی طبع زاد تمثیل ہے۔اسے پڑھ کر مصنف کی مشاقی اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ان سب تمثیلوں کی زبان سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔کہیں بھی نامانوس اور بوجھل الفاظ وتراکیب کا استعمال نہیں۔ہر جگہ لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔اس کے علاوہ نثری تمثیل نگار کو جو ہر عمر اور ہر طبقے کے سامعین کی پسند وناپسند اور ان کی ذہنی ضروریات کا خیال ہوتا ہے، مصنف نے ان کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور یوں یہ تمثیلیں ہر طبقہ خیال اور ہر عمر کے سامعین کے لئے جاذبِ توجہ ہو گئی ہیں۔

کتاب کا پیشِ لفظ بادشاہ حسین نے لکھا ہے جس میں انہوں نے ریڈیائی ڈرامے کے فن کے بارے میں قارئین کو بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔اس کے علاوہ آفاق صدیقی نے "دید وشنید" کے عنوان سے کتاب کے مصنف کا تعارف اور زیرِ تبصرہ تمثیلوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا

ہے۔مجموعی طور پر ’’صورت گر‘‘ ایک معیاری پیش کش ہے اور اس وقت جبکہ ریڈیائی ڈرامہ ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔امید ہے ڈراموں کا یہ مجموعہ قارئین میں قبولِ عام کی سند حاصل کرے گا۔

....

حدیثِ خواب

’’حدیث خواب‘‘ عبدالعزیز خالد صاحب کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔جس میں اُنتیس طویل ومختصر نظمیں اور چھتیس غزلیں شامل ہیں۔طویل نظموں میں ’’حکایت نے‘‘ ’’تسخیر قمر‘‘ ’’ابوالحسن کا خواب‘‘ ’’ہم‘‘ ’’نامۂ نقش گر‘‘ ’’اِک پیکرِ تصویر کے نام‘‘ اور ’’اے مرے خوابو سنو!‘‘ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ یہ اُن کے خاص ڈکشن میں لکھی گئی ہیں۔کتاب کا آغاز ’’حکایت نے‘‘ سے ہوتا ہے یہ طویل نظم ایک سو باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی تلمیحات نظم کی گئی ہیں جن کا تعلق دنیا کے بیشتر خطوں کے زبان و ادب سے ہے۔اُردو کی طویل نظموں میں یہ نظم اس لیے بھی نمایاں اور ممتاز ہے کہ ایک ہی موضوع یعنی محبّ اور محبوب کی باہمی نسبت کو بیسیوں اشعار کی صورت میں تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن کہیں بھی دلچسپی کی کمی یا یکسانیت محسوس نہیں ہوتی۔پوری نظم میں ایک تازگی ہے جو آخر تک برقرار رہتی ہے۔چند اشعار دیکھیے:

ترے دیار کی خوشبو سے اے چمن آرا
مشامِ جاں کو معطر کرے نسیمِ صبا

....

میں سوہنی تو مہینوال اے مرے دلدار!
میں صاحباں ہوں تو مرزا میں ہیر تو رانجھا

....

تو بے نظیر ہے میرا میں تیری بدرِ منیر
میں ہوں بکاولی تاج الملوک نام ترا

....

تو مانگ چاؤ شہنشاہ چمن میں لی جائے
میں جو زمیق تیری تو پنولین میرا

ایک اور نظم ہے "ہم" معاشرے میں اہلِ قلم کے مقام و منصب کو متعین کرتے ہوئے اس نظم میں خالد کہتے ہیں:

ہم البیرونی عصرِ رواں ہیں
رہین خانہ و بے خانماں ہیں
نہیں عرضِ ہُنر کا ہم کو سودا
فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں
اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے
مگر دانائے رازِ آسماں ہیں
اجل سے رات دن دست و گریباں
نظرِ گاہِ حیاتِ جاوداں ہیں

"اے مرے خوابو سُنو!" خوبصورت نظم ہے اس نظم میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خالد کی عام نظموں کے مقابلے میں ترنم اور نغمگی زیادہ ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

اے شبِ رفتہ کی تانو! اے گئے دن کی دُھنو!
موجِ غم کا کوئی تھل بیڑا کوئی ساحل نہیں
یوں نہ میرے ذہن میں افسوس کے جالے بُنو
یوں نہ میرے دل میں تنہائی کی دیواریں چنو

اے مرے خوابو سُنو!

اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طویل نظموں کے دوش بدوش خالد کی متعدد مختصر نظمیں موجود ہیں، ان نظموں کا ایجاز ہی خالد کے کمالِ فن کا اعجاز ہے، مثال کے طور پر تحفہ

کے عنوان سے ایک نظم دیکھئے:

میں خوشی کی طرح تہِ دل سے
رنج و غم کو قبول کرتا ہوں
دوست کا یہ گراں بہا تحفہ
مسکرا کر وصول کرتا ہوں

خالد کی شاعری وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کی شاعری ہے اُردو نظم میں جس عالی اُسلوب کی بنیا د سودا، ذوق اور انیس نے رکھی تھی اور اقبال اور جوش نے اسے ایک نئی توانائی بخشی تھی۔ اُسی عہد آفریں اُسلوب کو خالد نے اپنی طویل نظموں میں آگے بڑھایا ہے اور یوں انہوں نے بلا مبالغہ ہمارے عصری ادب کو ایک نیا شعری لہجہ عطا فرمایا ہے اسی پرشکوہ لہجے کی بنا پر انہیں عام طور طبعاً نظم کا شاعر کہا جاتا ہے، لیکن ایسا کہنا اُن کے پورے سرمایہ شعر و فن سے پوری طرح آشنا نہ ہونے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں وہ صنفِ نظم پر فریفتہ ہیں وہاں غزل کے تیرِ نگاہ کے بھی گھائل ہیں۔ اس لیے کہ اُنہوں نے ہمارے دوسرے نظم گو شعرا کے مقابلے میں صنفِ غزل کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی اُن کی نظموں سے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ الگ بات ہے اُن کی غزل پر بھی اُن کی نظم کا گہرا اثر ہے کہ اس میں بھی اُن کی نظم کی سی بلند آہنگی تسلسل تفکر اور ترفع ہے۔ یوں اُن کی غزل بھی ہمارے ہاں ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کے موضوعات کائنات کی طرح وسیع اور زندگی کی طرح لامحدود ہیں۔ پھر فنی نقطہ نظر سے بھی وہ دوسرے غزل نگاروں کے مقابلے میں اپنی ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اکثر بحروں کے انتخاب میں اُن کی طبیعت منفرد ہے۔ اسی طرح اُن کے ہاں بیشتر غیر مردف غزلیں ملتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ ردیف کی بہ نسبت قافیے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی غزل کے بارے میں مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک تازہ پُرشکوہ اور توانا اُسلوب کی حامل ہے اور اس میں روحِ عصر کا مکمل ادراک اور اظہار ہے، ایک جگہ کہتے ہیں۔

الفاظ مختصر ہوں معانی ہوں تہ بہ تہ

تخلیقِ فن میں حُسن بھی ہو روح عصر بھی

یہ غزل اس مجموعے کی بہترین اور نمائندہ غزل کہی جا سکتی ہے:

الفاظ پُر آواز مگر قحطِ نوا ہے
یہ ساعت نا محکمی حرفِ وفا ہے
کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
وہ شورِ قیامت ہے کہ شل دستِ دعا ہے
اے شیشہ گرو ہے کوئی پیوند کی صورت؟
ٹوٹا ہے وہ آئینہ کہ جو قبلہ نما ہے
احساس پہ موقوف ہے شیرینی و تلخی
نغمہ طرب آور ہے اندوہ رُبا ہے
ہے فہم سے مافوق پہ اسرارِ تخلیق
صَر صَر اگر آہنگ میں ڈھل جائے صبا ہے

ان غزلوں کے اشعار کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں اُنہوں نے واقعی الفاظ کے صَر صَر کو اپنی غزل کے آہنگ میں ڈھال کر صبا کی سی لطافت و تازگی عطا کی ہے۔

"حدیث خواب" خالد کے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ مترنم اور منتخب ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعہ جہاں خالد کے شعری کمالات میں ایک وقیع اضافہ ثابت ہوگا، وہاں اُردو شاعری میں بھی ایک خوبصورت مجموعے کے طور پر قبولیت کی سند حاصل کرے گا۔

....

لب گفتار

"لب گفتار" اختر انصاری اکبرآبادی کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی ۴۳ غزلیں ۴۸ باعیاں اور چند منتخب اشعار شامل ہیں۔ اختر صاحب اردو کے جانے پہچانے اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے کے علاوہ کوئی درجن سے زیادہ شعری ادبی کتابوں کے مصنف و مرتب بھی ہیں مگر ان کا یہ مجموعہ کئی لحاظ سے ان کی دوسری کتابوں سے ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ اول یہ کہ اس میں ان کی تازہ ترین تخلیقات شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام روایت سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے کسی رسمی دیباچے یا پیش لفظ کا سہارا نہیں لیا اور قارئین تک براہ راست اپنی بات پہچانے کی سعی کی ہے۔

اختر انصاری اکبرآبادی اُردو غزل کے اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے ہاں روایت کا حسن اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم انہیں روایت پرست شاعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں حسنِ روایت کے ساتھ ساتھ جدت فکر کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ وہ افراط و تفریط کے فراز و نشیب سے بچتے ہوئے راہ اعتدال پر سلامت روی سے گامزن ہیں۔ قدرت بیان اور پختگی فن کے علاوہ وہ دورِ حاضر کے سماجی معاشی اور سیاسی حالات کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی غزل میں خالص عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ اس شعور کا بھی نمایاں عکس دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً تسخیر کائنات کے حوالے سے عظمتِ آدم ان کا محبوب موضوع ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر ذرہ جو پستی کا ہوتا رہا تابندہ
یہ چاند ستارے سب ہو جائیں گے شرمندہ
کس بلندی پہ رواں تم ہو زمین کے ذرو!
ہیں ستارے نگراں اور ذرا تیز قدم

اسی طرح زمینی رشتوں سے اپنے گہرے تعلق کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

اگر زمین کے ذرے پکارتے نہ ہمیں
تو آسماں کے ستاروں سے گفتگو کرتے

ان کی غزلوں کا لہجہ کلاسیکی اور موضوع زندگی کی رنگا رنگ حقیقتوں کا ادراک واظہار ہے یہ اشعار دیکھئے۔

پھر ایک جانب ہیں تند موجیں کہیں سفینے بھٹک نہ جائیں
جو تیرگی میں چراغ ساحل نظر نہ آیا تو کیا کرو گے

غزل کی ریزہ خیالی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں

گلدستہ معنی تو نہیں ہے غزل اختر
افکارِ پریشان کا یہ شیرازہ ہے شاید

لیکن یہ بات عجیب ہے کہ ان کی غزل افکارِ پریشان کی شیراہ بندی ہوتے ہوئے بھی گلدستہ معنی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لئے کہ ان کے ہاں تقریباً ہر غزل میں داخلی طور پر معنوی ربط وتسلسل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ایک اور بات جو اس مجموعے کی غزلوں میں ملتی ہے۔وہ شاعری مختلف النوع بحروں میں طبع آزمائی ہے۔انہوں نے عام شعرا کے برعکس چند مستعمل بحروں کی جگہ زیادہ سے زیادہ مختلف بحروں کو استعمال کیا ہے۔مگر ان میں بھی ترنم اور شگفتگی کو ملحوظ رکھا ہے۔

رباعی ہمارے ہاں صنف سخن کے طور پر اس دور میں اتنی مروج ومقبول نہیں رہی۔لیکن اس کے باوجود دورِ جدید کے کچھ شعراء نے اس صنف کے احیاء کی طرف بھی سنجیدگی سے توجہ دی ہے اور اختر انصاری اکبرآبادی بھی ان میں شامل ہیں۔عام طور پر رباعی اخلاقی حکیمانہ صوفیانہ مضامین تک محدود رہی ہے اور بالخصوص جب بے ثباتی دنیا اس کا موضوع ہو تو اس کا لہجہ انتہائی حزینہ اور ریاس زدہ ہوتا ہے۔لیکن ان کی غزل کی طرح رباعی میں بھی ان کا لہجہ نشاطیہ ہے وہ امید پرست

اور رجائی ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات عزم وعمل کی علامت ہیں۔زندگی کے بارے میں یہ مثبت اندازِ فکر یقیناً صحت مندانہ اور تعمیری ہے۔مثلاً ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

ہو پھول تو تازگی کو ثابت بھی کرو
ہو شمع تو روشنی کو ثابت بھی کرو
ہے نام تو پھر گوشہ گمنامی کیسا
زندہ ہو تو زندگی کو ثابت بھی کرو

غرض "لب گفتار" ہمارے شعری مجموعوں میں ایک ایسا خوشگوار اضافہ ہے۔جسے نئے اور پرانے دونوں ادبی حلقوں میں پسندیدگی نظر سے دیکھا جائیگا۔

....

اردو کے خوابیدہ الفاظ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اردو کے ایسے الفاظ کا ذکر ہے جنہیں ہم بول چال اور لکھنے پڑھنے میں آجکل بہت کم استعمال کرتے ہیں۔

لیکن ہماری علاقائی زبانوں میں یہ کسی نہ کسی طرح زندہ ہیں۔ بقول اشفاق احمد یہ الفاظ خوابیدہ ضرور ہیں۔ مگر متروک نہیں کیونکہ ایک تو علاقائی زبانوں میں ان کے روزمرہ استعمال نے انہیں زندہ رکھا ہے۔ دوسرے اردو کے مستعمل محاوروں اور ضرب الامثال میں گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زبان اپنی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے ایک وسیع اور ہمہ گیر زبان ہے اور اس میں اظہار بیان اور معانی ومطالب کے نازک اور لطیف پہلوؤں کیلئے ہر طرح کا لفظ موجود ہے۔ اس مختصری کتاب کا مقصد قارئین کو چند ایسے الفاظ سے روشناس کرانا ہے۔

اس کتاب میں شامل الفاظ کو جن تین معروف لغتوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ ان کے نام ہیں فرہنگ آصفیہ مولفہ مولوی سید احمد دہلوی مطبوعہ دلی ...... نور اللغات مؤلفہ نور الحسن نیر مطبوعہ لکھنؤ اور Adictionary of Urdu , classical Hindi and English مطبوعہ لندن۔

اگرچہ اس کتاب کے الفاظ کی فہرست میں اضافے کی بھی گنجائش تھی تاہم اس مختصری لغت میں خوابیدہ الفاظ کا جو بیش قیمت ذخیرہ دے دیا گیا ہے۔ وہ لائق تحسین ہے اس ذخیرے کے بیشتر الفاظ ہماری خاص توجہ چاہتے ہیں مثال کے طور پر آلا، بالن، باوا، بڑک، لکل، تمبو، ٹیوا، خیر سلا، رسادل، سالو، ثمرت، سوتک، گگ، ماڑا، مخول، ملوک، میل خورا ور مینڈی ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہماری تحریر وتقریر میں ان کا کھویا ہوا مقام ملنا چاہیے۔

لغاتِ سرائیکی

سرائیکی زبان خطہ پنجاب میں پنجابی کے بعد دوسری بڑی زبان ہے۔ اس کو بولنے والے ملتان ڈیرہ غازیخان اور بہاول پور ڈویژن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملتان کی زبان کو ملتانی اور بہاولپور کی زبان کو بہاولپوری کہتے ہیں لیکن ہر دو مقامات کی بولی، اس کا لب ولہجہ اور ادب کا سرمایہ یقیناً ایک ہے اور علاقائی تفاوت ختم کر کے اسے ایک نیا نام دیا گیا ہے۔ سرائیکی جو معنوی لحاظ سے ملتانی یا بہاولپور سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور لسانی وحدت کا ترجمان ہونے کی وجہ سے اہم ہے۔

زیر نظر کتاب سرائیکی زبان کی لغات ہے ایک عرصے سے سرائیکی اُردو لغات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن کوئی ماہر لسانیات اس طرف توجہ نہ دے سکا محمد بشیر احمد ظامی بہاولپوری صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سرائیکی کی پہلی لغات مرتب کر کے ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصے میں سرائیکی کے الفاظ اور اردو میں ان کے معنی درج ہیں اور یہ حصہ نصف سے زیادہ کتاب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ سرائیکی محاورات، ضرب الامثال پہیلیاں اور خوانچہ والوں کی آوازوں پر مشتمل ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے تیسرے حصے میں سرائیکی بولنے والے علاقے کی رسوم و روایات تہذیب وتمدن لوک گیت، لوک ناچ اور لوک کہانیوں کے بنیادی تذکرے شامل ہیں جن سے اس علاقے کے لوگوں کی ثقافت ومعاشرت کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس تیسرے حصے کے اضافے سے کتاب کی افادیت اور جامعیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے کتاب کے آغاز میں سرائیکی حروف تہجی اور آخر میں گنتی بھی شامل ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک لغات ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سرائیکی زبان وادب کی ایک اہم دستاویز ہے کسی زبان کی لغات مرتب کرنا فرد واحد کا کام نہیں۔ اس کے لئے ایک مستقل

ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ظامی صاحب کی یہ کوشش ان کی انفرادی کوشش ہے۔اس کے ساتھ ساتھ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ لغات اپنی نوع کی پہلی کاوش ہے۔اس لئے بعض مقامات پر مطالب ومعانی میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے یا ممکن ہے ترتیب میں کئی اہم امور رہ گئے ہوں۔اسی طرح بہاولپوری اور ملتانی رسم الخط میں بھی اختلاف ہے۔اس کتاب میں بہاولپوری رسم الخط کا استعمال کیا گیا ہے جو ملتان والوں کے لئے محل نظر ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ سرائیکی کے نام کی طرح اس کے رسم الخط میں بھی یکسانیت پیدا کی جائے۔

بہر حال یہ کتاب اپنی نوع کی پہلی کامیاب کوشش ہے اوراس سلسلے میں ظامی صاحب کی محنت وکاوش قابل داد ہے۔ہماری رائے میں ایسی مفید کتاب کا ہر قومی ونجی دارالمطالعے میں ہونا ضروری ہے۔

رفتگانِ ملتان

ملتان مدینۃ الاولیاء ہی نہیں،شہر ادب وفن بھی ہے کہ یہ معمورہ ہر دور میں مختلف باکمال شخصیات سے آباد رہا ہے۔ادیب،شاعر،صحافی،استاد اور دانشور ہر شعبے سے متعلق افراد کی ایک کہکشاں ہے جو ہر عہد میں جگمگاتی رہی ہے۔اس کہکشاں کے ستارے اگرچہ ایک ایک کر کے ڈوبتے چلے گئے لیکن ان کی روشنی آسمان ادب پر کسی نہ کسی طرح آج بھی محسوس ہوتی ہے۔آج بھی صابر دہلوی،پرواز جالندھری،قمر لکھنوی اور ہلال جعفری کا دل گداز ترنم اس شہر کی فضاؤں پر چھایا ہوا ہے۔آج بھی کشفی ملتانی،آغا خاموش،گلچیں کرنالی،صادق مصور،تاثیر نقوی اور صوفی رامپوری کا دل نشیں تحت اللفظ چار سو گونجتا ہے۔آج بھی افق کاظمی،عزیز حاصل پوری،ادب سیمابی،مذاق العیشی اور خادم کیتھلی کی عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی پرسوز آوازیں ہواؤں میں رہ رہ کے ابھرتی ہیں۔لیکن بکھری ہوئی آوازیں اس خطے کی فضا کا مستقل حصہ تبھی بن سکتی ہیں۔جب ہم

ان کی یاد کو بار بار دوہراتے رہیں۔ ماضی بعید کی تو بات ہی کیا؟ ہم ماضی قریب کے لوگوں کو بھی رفتہ رفتہ بھولتے جا رہے ہیں۔ مثلاً نور احمد خان فریدی، خلیق ملتانی، قیصر ہوشیار پوری، شمیم شمسی، انور مرزا، سجاد بریلوی، عبدالغنی فوق، کیفی جامپوری، پروانہ بجنوری، طاہر کپور تھلوی، ریاض انور، منیر فاطمی، صوفی آذر، مقبول تنویر، وحشت ملتانی، رشید روہتکی، چاچا جگ، ذوالفقار راغب، سجاد یزدانی، رنگین فیروز آبادی، مکیش لکھنوی، جمیل صدیقی، تصدق رسول، شوکت رسول پوری، احسن نسیم، ابوالحسن قاسمی، شیخ اکرام الحق اور منشی عبدالرحمٰن۔

زندہ قومیں وہ ہیں جو اپنے زندوں کو یاد رکھتی ہیں ہم تو اپنے مردوں کو بھی یاد نہیں رکھتے۔

ہم میں سے کتنے ہوں گے جو آج ظہیر شہرتی، راقی براہیمی، ابراہیم شارب، منظر قریشی، اسلم شیخ، الیاس جوہر، عبدالسلام حیدر، عبدالستار دل، سجاد کلیم، قیصر درانی، سروش درانی، مسلم دہلوی، اسرار تابش، عبدالرحیم ثانی، گلزار تبسم، کمال احمد ضیا اور نثار رخاور کے نام سے بھی آشنا ہوں۔

رضی الدین رضی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے رفتگانِ ملتان میں سے کم و بیش تمیں شخصیات کی یادوں کو اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً حیدر گردیزی، خان رضوانی، محسن گردیزی، منیر فاطمی، طفیل ابن گل، حزیں صدیقی، تابش صمدانی، حق نواز خرم، زوار حسین، بیدل حیدری، قمر الحق قمر، ابن حنیف، عرش صدیقی، ضیغم شمیروی، نثار احمد اختر، شعیب الرحمٰن، مقصود زاہدی، ارشد ملتانی، عارف محمود قریشی، قاسم عدیل، اسلم یوسفی، ولی محمد واجد، عمر کمال خاں، ممتاز حیدر ڈاہر، جعفر شیرازی اور ممتاز العیشی وغیرہ۔

بقول رضی یہ مضامین اس نے خود نہیں لکھے بلکہ موت نے اس سے لکھوائے ہیں۔ وہ لکھتا ہے ...... "یہ رفتگانِ ملتان کے نوحے ہیں، یہ میری اپنی موت کی کہانی ہے۔ لحظہ لحظہ موت کی کہانی ...... اور حقیقت بھی یہ ہے کہ موت ایک دم نہیں آتی۔ یہ رفتہ رفتہ مکمل ہوتی ہے۔ ہم آہستہ آہستہ مرتے ہیں۔ کسی پیارے کسی دوست کی بزرگ یا کسی استاد کی موت ہمیں لحہ لحہ زندگی سے دور کرتی جاتی ہے۔ ہر موت کے نتیجے میں ہمارے کچھ معمولات ہم سے چھن جاتے ہیں۔ ہماری

محفلوں کی رونق کم ہوتی ہے۔ ہم کچھ منظروں کچھ چہروں اور کچھ آوازوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہر دوست بچھڑتے وقت ہمارے دامن میں اپنے حصے کی ایک تنہائی ڈال جاتا ہے۔ وہ وقت جو ہم اس دوست کے ساتھ گزارتے تھے۔ وہ ہم کسی اور کے ساتھ نہیں گزار سکتے۔ ہم ہر دوست کی موت پر ایک نئی تنہائی کا شکار ہوتے ہیں اور یہ بہت سی تنہائیاں مل کر رفتہ رفتہ ہمیں بالکل تنہا کر دیتی ہیں۔ پھر ہمیں قبر کی تنہائی نصیب ہوتی ہے اور یوں موت کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔"

موت کے بارے میں رضی کا یہ فلسفہ کتنا گہرا اور کتنا سچا ہے .... حقیقت یہ ہے کہ موت سے بڑی حقیقت کوئی نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ رضی کو زندگی سے زیادہ موت میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ موت کی طرف بے ساختہ متوجہ ہوتا ہے جیسے وہ اس کی محبوبہ ہو۔ موت سے اس کا سب سے پہلا تعارف صرف ساڑھے تین سال کی عمر میں اس جنازے کی صورت میں ہوتا ہے جو اس کے والد کا جنازہ تھا اور پھر جنازوں کے تسلسل نے اسے موت سے اس قدر مانوس کر دیا کہ اُس نے گزرے ہوئے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے نوحے لکھنا شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ یہ ماتمی تحریریں یہ تعزیتی کالم، یہ نوحے، مضامین کے ایک قبرستان کی شکل اختیار کر گئے اور رفتگانِ ملتان وجود میں آ گئی۔

عام طور پر لوگ مرنے والوں کی یاد میں مرثیے لکھتے ہیں لیکن رضی نے ان کی یاد میں نوحے کہے ہیں اور وہ بھی نثر میں۔ مرثیے اور نوحے میں یہ فرق ہے کہ مرثیہ لکھنے والا صرف اوروں کو رلاتا ہے۔ جبکہ نوحہ کہنے والا خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے ...... یوں ایک طرح سے نوحہ کہنے والا موت کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے اور رضی نے یہ مکالمہ کچھ اس ڈھب سے کیا ہے کہ اس کی ذات بھی خود اس کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

ان نوحوں کو لکھ کر رضی خود تو رویا ہی ہو گا میں نے بھی اس کے حرف حرف پر آنسو بہائے ہیں۔ کہ یہ میرے بھی پیاروں کے جاں گداز تذکرے ہیں۔ اپنے عہد کے رفتگاں کی یادوں کو تازہ کر کے رضی نے جیسے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ ایک قرض اور ایک فرض جو اہلِ ملتان پر واجب

تھا۔اسے پورا کیا ہے۔مگراس سے بھی بڑاقرض ابھی باقی ہے۔ماضی قریب کے رفتگاں کی یادوں کوتازہ کرنے کافرض ۔کہ اسے رضی سے سینئر لوگوں کواداکرنا ہے۔کاش کوئی اوررضی الدین رضی یہ قرض اورفرض پورا کردے۔

رضی کوقسامِ ازل نے شاعرکادل ادیب کی زبان اورصحافی کی نظرعطا کی ہے۔اس نے ان صفات سے پوراپورافائدہ اٹھایا ہے۔چنانچہ ان تحریروں میں کہیں شاعری کا سالطف ملتا ہے۔کہیں کہانی کی سی دلچسپی اورکہیں خاکے کی سی مرقع نگاری۔اس کااسلوب اس قدر دل نشیں ہے کہ پڑھتے ہوئے آپ اس کتاب کوادھورانہیں چھوڑسکتے۔اسے ایک ہی نشست میں پوراپڑھیں گے۔

یہ کتاب دبستانِ ملتان کی تاریخ کاایک حصہ ہے اوراسے لکھ کررضی نے ملتان کے ایک عہداورایک دورکی شخصیات کےنام اورکام کوہمیشہ کے لئے زندہ کرکےایک قابل قدرکارنامہ انجام دیا ہے۔کتاب کے آخر میں شخصیات مقامات اوراخبارات کاایک اشاریہ بھی شامل ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت میں مزیداضافہ ہوگیا ہے۔

....

گُماں

"گُماں" اُردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر میاں مقبول احمد کا تازہ مجموعہ کلام ہے۔اس سے پیشتر پنجابی میں ان کے دو مجموعے"پھلاں"اور"گلاں" کے نام سے اور اُردو میں"نارسا"، "محبس"اور"میں نے کچھ پھول چنے"منظرِ عام پر آچکے ہیں۔"نارسا"میں ان کی نظمیں ہیں۔ جبکہ"محبس"میں غزلیں، اور"میں نے کچھ پھول چنے"میں ان کے شعری تراجم شامل ہیں۔

"گُماں"اس لحاظ سے ان کی منفرد کتاب ہے۔کہ اس میں ایک ہی مختصر بحر اور ایک سے قافئے ردیف میں یعنی ایک ہی زمین میں ان کی مسلسل پچاس غزلیں شریک ہیں۔جو بذاتِ خود ایک تجربہ ہے۔گویا انہوں نے ایک طویل غزل یا دوسرے لفظوں میں پنجاہ غزلہ کہا ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ان غزلوں میں زمانے کے اعتبار سے کہیں ماضی شکیہ کی فضا ہے اور کہیں مستقبل کی۔ یعنی ایسی فضا ہے جو یقین سے زیادہ گُماں سے قریب ہے۔اسی لئے غالباً اس کا عنوان"گُماں" تجویز کیا گیا ہے۔

ان غزلوں کی زبان رواں دواں، شگفتہ اور سادہ ہے اور ان کا موضوع غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔گویا ان میں تغزل بھی ہے اور تفکر بھی۔اس لحاظ سے میاں صاحب کا یہ فنی تجربہ جہاں اپنے اندر معنوی وسعت وندرت اور تازگی لئے ہوئے ہے۔وہاں اس میں قاری کے لئے ایک دلچسپی بھی ہے۔

حسین سحر

ملتان